المنار جرمنی

T.I. College Old Students Association Germany

ٹی آئی کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

زیرِ نگرانی: پروفیسر چوہدری حمید احمد صاحب

سرپرست تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ جرمنی

صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی

چوہدری عبدالغفور ڈوگر

مدیر اعلیٰ: چوہدری محمد کولمبس خاں

(E-Mail: columbuskhan@gmail.com)

Bait- us -Sabooh ، Genferstrasse 11 ،60437 Frankfurt / M

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
1	ارشاد باری تعالیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرمان رسول عربی ﷺ	3
2	ملفوظات حضرت مسیح موعودؑ۔۔۔۔۔ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ	4
3	پیغام صدر۔	5
4	امتیازی خصوصیات۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن	6
5	کلام حضرت مصلح موعودؓ۔۔۔۔۔۔کلام حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ	7
6	دنیا کی آبادی میں احد من الناس کا اضافہ۔ محترم مسعود احمد دہلوی (سفر حیات)	8
7	وقت دعا۔کلام راجہ محمد یوسف خان	10
8	ہمیں بھی عہد کے انجام سے تھی دلچسپی۔کلام چوہدری محمد علی مضطرؔ	10
9	میری ہستی کو محیطِ گوہر اسرار کر دے۔۔۔۔کلام مصلح الدین راجیکی	11
10	تصویر ادھوری رہتی ہے۔۔ڈاکٹر محمد اسلم ناصر آسٹریلیا	12
11	رمضان پیکٹ۔۔۔ شیخ منصور احمد جنرل سیکریٹری	13
12	می لارڈ یہ بچی چڑیل ہے۔۔۔ابونائل	14
13	نعت۔۔۔۔مکرم طاہر مجید صاحب	17
14	“I am Still Alive” | Gaza Day 100- From Review of Religions	20
15	سائرن یا نیرو کی بانسری۔۔۔۔۔ محمد کولمبس خاں	21
16	کلام مکرم چیف معین شاہ صاحب	23
17	کیا سائنیدان مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں۔۔ازالم نگار	24
18	پنجاب توہین مذہب سے جڑی متشدد سوچ کا مرکز کیسے بنا۔۔از ندیم فاروق پراچہ	26
19	شکر اے مہربان تیرا۔۔۔۔۔کلام مکرم منیر احمد صاحب باجوہ	30
20	اُڑنے والے جانور جو پرندے نہیں ہیں۔۔۔۔ازالفضل انٹرنیشنل	32
21	اٹم چلادو۔پھر کیا ہو گا۔۔۔۔ازالم نگار	33
22	فوٹوز کے سلسلہ میں اہم اور تاکیدی ارشاد۔ازبدر قادیان	36
23	ساٹھ سال پہلے "المنار" کا سرورق۔۔	37
24	زبان بگڑی، دہن بگڑا۔۔۔۔ازانتظار حسین	38
25	فربہ مجاز لوگ درکار ہیں جو سوچتے نہ ہو۔۔۔۔ازالم نگار	40
26	ایہام گوئی۔۔۔ آزاد دائرۃ المعارف	42
27	اہم اعلان بابت قازخستان ٹور۔۔صدر ٹکوسا جرمنی	44
28	باسکٹ بال میچ۔جرمنی انگلستان	46

ارشادِ باری تعالیٰ

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۵﴾ؕ

Dein Herr hat geboten: „Verehret keinen denn Ihn und (erweiset) Güte den Eltern. Wenn eines von ihnen oder beide bei dir ein hohes Alter erreichen, sage nicht einmal ‚uff' zu ihnen und schelte sie nicht, sondern sprich zu ihnen freundliche Worte. - Und neige gütig gegen sie den Fittich der Demut und sprich: ‚O mein Herr, erbarme Dich ihrer, so wie sie für mich sorgten als ich klein war.

اور تیرے ربّ نے فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ تم اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے احسان کا سلوک کرو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک تیرے پاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچے یا وہ دونوں ہی، تو اُنہیں اُف تک نہ کہہ اور انہیں ڈانٹ نہیں اور انہیں نرمی اور عزت کے ساتھ مخاطب کر۔ اور ان دونوں کے لئے رحم سے عجز کا پَر جُھکا دے اور کہہ کہ اے میرے ربّ! ان دونوں پر رحم کر جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری تربیت کی۔(بنی اسرائیل)

فرمانِ رسولِ عربی ﷺ

حُذَيْفَةَ بن اليَمَان رَضِىَ الله عَنْہُ] يَقُوْلُ كَانَ أصْحَابُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَهُ عَنِ الْخَيْرِ وَأسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ هَلْ بَعْدَ هَذَا الْخَيْرِ شَرٌّ كَمَا كَانَ قَبْلَهُ شَرٌّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ فَمَا الْعِصْمَةُ مِنْہُ... قَالَ فَاِنْ رَأَيْتَ يَوْمَئِذٍ خَلِيْفَةَ اللهِ فِى الْاَرْضِ فَالْزَمْهُ وَاِنْ نُهِکَ جِسْمُکَ وَأُخِذَ مَالُکَ۔فإنْ لَمْ تَرَهُ فَاهْرُبْ فِيْ الْأَرْضِ وَلَوْ أنْ تَمُوْتَ وَأنْتَ عاضٌّ بجِذْلِ شَجَرَةٍ۔

(مسند احمد بن حنبل، باقی مسند الانصار، حدیث حذیفۃ بن الیمان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم 22916)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے] کہا کہ (میرے ساتھی) صحابہ رسول اللہ ﷺ سے اچھی باتوں کے متعلق پوچھا کرتے تھے جبکہ مَیں آپ ﷺ سے شر کے متعلق پوچھتا تھا۔ مَیں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اس خیر کے بعد بھی کوئی شر ہو گا جیسا کہ اس سے پہلے تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ مَیں نے کہا کہ اس سے بچنے کا کیا طریق ہے؟... آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ:

اگر تُو اس وقت اللہ کے خلیفہ کو زمین میں دیکھے تو اسے مضبوطی سے پکڑ لینا اگرچہ تیرا جسم نوچ دیا جائے اور تیرا مال چھین لیا جائے۔ اور اگر تُو اُسے (اللہ کے خلیفہ کو) نہ دیکھے تو زمین میں (کہیں) بھاگ جانا خواہ تم اس حال میں مرو کہ تمہیں درخت کی جڑیں چبانی پڑیں۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

نماز باجماعت اور اس میں صف بندی کی حکمت

اسلام کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ جیسے باپ اپنے حقوقِ ابوت کو چاہتا ہے اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ اولاد میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ ایک دوسرے کو مارے۔ اسلام بھی جہاں یہ چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہ ہو وہاں اس کا یہ بھی منشاء ہے کہ نوع انسان میں مودّت اور وحدت ہو۔ نماز میں جو جماعت کا زیادہ ثواب رکھا ہے اس میں یہی غرض ہے کہ وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اس وحدت کو عملی رنگ میں لانے کی یہاں تک ہدایت اور تاکید ہے کہ باہم پاؤں بھی مساوی ہوں اور صف سیدھی ہو اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ گویا ایک ہی انسان کا حکم رکھیں اور ایک کے انوار دوسرے میں سرایت کر سکیں وہ تمیز جس سے خودی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے نہ رہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ دوسرے کے انوار کو جذب کرتا ہے۔ پھر اسی وحدت کے لئے حکم ہے کہ روزانہ نمازیں محلّہ کی مسجد میں اور ہفتہ کے بعد شہر کی مسجد میں اور پھر سال کے بعد عید گاہ میں جمع ہوں اور کُل زمین کے مسلمان سال میں ایک مرتبہ بیت اللہ میں اکٹھے ہوں۔ ان تمام احکام کی غرض وہی وحدت ہے۔ (لیکچر لدھیانہ، روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 282-281)

قرآن کریم کا ادب بھی یہی ہے کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے

قرآن کریم کو جیسا کہ ہم جانتے ہیں رمضان سے ایک خاص نسبت ہے۔ اس کا نزول اس مہینے میں شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے حضور مناجات کو خدا تعالیٰ نے سنا اور اپنی رحمت کے دروازے کھولے اور دنیا کو گند اور شرک میں پڑا ہوا دیکھ کر بے چین اور بیزار ہونے والے وجود کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کے لئے آخری شرعی کتاب دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ اور پھر 23 سال کے لمبے عرصہ تک یہ شریعت اترتی رہی اور جبریل آپؐ کے پاس ہر رمضان میں اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کا ایک دَور مکمل کرواتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سال (جس سال آپؐ کا وصال ہوا) اس سال کا جو رمضان تھا، اس سال میں جبکہ شریعت مکمل اور کامل ہو چکی تھی جبریل نے دو دفعہ قرآن کریم ختم کروایا۔ پس یہ سنّت ہے جس کو مومن جاری رکھتے ہیں۔ اور کم از کم ایک یا دو دفعہ رمضان میں قرآن کریم کا دور مکمل کرتے ہیں، ختم کرتے ہیں، پڑھتے ہیں۔ اور جن کو توفیق ہو وہ دو دفعہ سے زیادہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن اتنی جلدی بھی نہیں پڑھنا چاہئے کہ سمجھ ہی نہ آئے کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جو اہل زبان تھے، عرب تھے ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جس نے تین دن سے کم عرصے میں قرآن کریم کو ختم کیا اس نے قرآن کریم کا کچھ بھی نہیں سمجھا۔

“(ترمذی۔ ابواب القراءات۔ باب ماجاء انزل القرآن علی سبعۃ اَحرفٍ)...

(خطبہ جمعہ فرمودہ 21/ اکتوبر 2005 مطبوعہ الفضل انٹرنیشنل 11/ نومبر 2005)

پیغامِ صدر

نہایت عزیز برادران! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے ہماری ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں ہر سال نہایت خوشکن اضافہ ہو رہا ہے۔ طلباء فنڈ کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے سے آغاز کیا گیا تھا جو سال بسال ترقی کرتے کرتے اب تین ملین سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔ اسی طرح افریقہ میں سکولوں اور مساجد کی تعمیر کے لئے بھی دوست از خود قربانی پیش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے اموال و نفوس میں برکت ڈالے۔

اولڈ سٹوڈنٹس ہونے کے لحاظ سے تعلیم السلام کالج کی روایات اور اقدار کو زندہ رکھنا اور اس کی اگلی نسلوں میں ترویج کرنا بھی ہمارے مشاغل کا حصّہ ہے۔ باہم ادبی، ورزشی اور تفریحی پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ اس میں بڑی محبت سے بھائی شامل ہوتے اور ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

ہمارے اکثر پروگرام خدا کے فضل سے روٹین کا حصّہ بن چکے ہیں۔ ان میں سے رمضان المبارک میں رمضان پیکٹ تیار کر کے مستحقین میں تقسیم کرنا، کھیلوں، سائیکل سفر، عید ملن پارٹی، مشاعرے، بزرگوں کی یاد میں آن لائین پروگرامز دوسرے ممالک کی سیر وغیرہ ہمارے مستقل آئیٹم بن چکے ہیں۔ گزشتہ برس جلسہ سالانہ کے موقعہ پر ہمارا سٹینڈ ایک بڑی نفع بخش قدم تھا جس کے ذریعہ نہ صرف ہماری تجنید اور مالی قربانی میں معتدبہ اضافہ ہوا بلکہ دیگر ممالک سے آئے ہوئے سابق طلباء کی اپنے کئی ساتھیوں سے کئی کئی سالوں کے بعد ملاقات اور یادوں کو از سرِ نو تازہ کرنے کا بھی باعث بنا۔

ٹکوسا جرمنی کی شناخت اپنی عاجزانہ خدمت کی بدولت بین الاقوامی سطح پر قائم ہو چکی ہے۔ اور سب سے بڑی ملکی شاخ ہونے کی وجہ سے ہماری ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور الحمد للہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز کی ہم پر خصوصی نگاہ شفقت بھی ہے جو ہماری مساعی کے انجام دینے کے لئے ہمہ وقت رہنما ہے۔

خاکسار

عبد الغفور ڈوگر

(صدر۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی)

تعلیم الاسلام کالج کی دیگر کالجز کی اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشنز سے

امتیازی خصوصیات

دوہری ایفیلی ایشن:

اس تنظیم کے ممبران کی ایفیلی ایشن کالج کے طالب علم ہونے کی وجہ سے اور اساتذہ کے ساتھ عقیدت کے تعلق کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سابق طلباء اپنی دینی اخوت کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ میں رہتے ہیں اور اس پہلو سے یہ تنظیم بین الاقوامی سطح پر اپنی نوع کی واحد تنظیم ہے۔

نئی نسلوں کی شمولیت:

یہ ایک امتیازی خصوصیّت ہماری تنظیم کی ہے کہ اس میں سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز نے ازراہ شفقت ہماری اگلی نسلوں کو بھی اس میں شامل کرنے کی تاکید فرمائی ہے تاکہ وہ بھی شاندار ماضی سے آگاہ ہو کر تنظیم کی سرگرمیوں میں شمولیت کرتے ہوئے اس میں اپنا حصّہ ڈال کر نبی نوع کے لئے مفید وجود بن جائیں۔

متنوع سرگرمیاں:

اس تنظیم کی سرگرمیوں کا دائرہ تعلیمی ادارہ کی ایک ہی عمارت میں سالانہ ڈنر تک محدود نہیں بلکہ تعلیمی، ادبی اور تفریحی سرگرمیوں میں خدمت خلق اور تاریخی یادوں کا اعادہ بھی شامل ہے جو جدید سہولتوں کی وجہ سے الحمدللہ اب بہت آسان ہو گیا ہے

خلیفہ وقت کی شفقت:

اس تنظیم کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ انتظامی طور پر یہ خلافت کے زیر نگرانی ہو جانے کی وجہ سے مستحکم ہو چکی ہے اور خلیفۂ وقت کی پُر شفقت رہنمائی اور نگرانی میں ہونے والی سرگرمیوں کی بدولت ممبران کا آپس میں تعلقِ اخوت مضبوط رہتا ہے۔

پرانی نسلوں کی تاریخ:

سلسلہ عالیہ احمدیہ میں آغاز ہی سے حصولِ علم کی فضیلت پر زور دیا جاتا رہا ہے اور دینی و دنیاوی علوم کے حصول کے لئے سلسلہ کے بزرگان نے سکولوں اور کالجوں کی تعمیر اور ترقی کے لئے قابلِ قدر منصوبے بنا کر ان پر عمل کیا اور ان میں معمولی الاؤنس پر خدمت بجالانے والے اساتذہ کی قربانیوں کا بھی بڑا دخل ہے جن کی وجہ سے تعلیمی ادارے دنیا میں ایک مثالی نیک نامی کا باعث بنے۔

کالج کی روایات کی مسلسل ترویج:

تعلیم الاسلام کالج کی روایات جن میں حسن عمل، حسن اخلاق، باہمی مؤدت، علم سے محبت، کھیلوں میں تحمل و بردباری، اساتذہ کا طلباء کے ساتھ حقیقی اولاد جیسا رویّہ جیسی روایات عام زندگی میں بھی رائج کرتے چلے جانا اس تنظیم کی ایک خصوصیّت ہے۔ پاکستان میں مستحق طالب علموں کے لئے خدا کے فضل سے تین ملین روپے سے زیادہ پیش کرنے کی توفیق پانا اس کی ایک مثال ہے

ہائے وہ دل کہ جسے طرزِ وفا یاد نہیں

(کلام حضرت مصلح موعودؓ)

ہائے وہ دل کہ جسے طرزِ وفا یاد نہیں
وائے وہ روح جسے قولِ بلیٰ یاد نہیں
بے حسابی نے گناہوں کی مجھے پاک کیا
میں سراپا ہوں خطا مجھ کو خطا یاد نہیں
جب سے دیکھا ہے اُسے اُس کا ہی رہتا ہے خیال
اور کچھ بھی مجھے اب اُس کے سوا یاد نہیں
ایک دن تھا کہ محبت کے تھے مجھ سے اقرار
مجھ کو تو یاد ہیں سب آپ کو کیا یاد نہیں
بے وفائی کا لگاتے ہیں وہ کس پر الزام
میں تو وہ ہوں کہ مجھے لفظِ دغا یاد نہیں
کوچہ یار سے ہے مجھ کو نکلنا دوبھر
کیا تجھے وعدہ ترا الغزشِ پا یاد نہیں
ہائے بدبختیِ قسمت کہ لگا ہے مجھ کو
وہ مرض جس کی مسیحا کو دوا یاد نہیں
ہم وہ ہیں پیار کا بدلہ جنھیں ملتا ہے پیار
بھولے ہیں روزِ جزا اور جزا یاد نہیں

اخبار بدر جلد 8۔20 مئی 1909ء

میدانِ حشر کے تصور سے

(کلام حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ)

نہ روک راہ میں مولا شتاب جانے دے
کھلا تو ہے تری "جنت کا باب" جانے دے
مجھے تو دامنِ رحمت میں ڈھانپ لے یونہی
حساب مجھ سے نہ لے، بے حساب جانے دے
سوال مجھ سے نہ کرا ے مرے سمیع و بصیر
جواب مانگ نہ اے "لاجواب" جانے دے
مرے گناہ تیری بخشش سے بڑھ نہیں سکتے
ترے نثار! حساب و کتاب جانے دے
تجھے قسم ترے "ستّار" نام کی پیارے
بروئے حشر سوال و جواب جانے دے
بلا قریب کہ یہ "خاک" "پاک" ہو جائے
نہ کر یہاں مری مٹی خراب جانے دے
رفیقِ جاں مرے، یارِ وفا شعار مرے
یہ آج پردہ دری کیسی؟ پردہ دار مرے

"الفضل" 5 جون 1954ء

دنیا کی آبادی میں احد من الناس کا اضافہ

(مکرم و محترم مسعود احمد دہلوی صاحب مرحوم ایڈیٹر "روزنامہ الفضل" کی خودنوشت "سفر حیات" سے)

1920 کے اوائل میں دنیا کی آبادی میں جو اضافہ ہوا اس میں دارالسلطنت دہلی کے کوچہ چیلان کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والے احد من الناس قسم کے ایک بچی کا اضافہ بھی شامل تھا۔16 فروری 1920 کو پیدا ہونے والا وہ واحد من الناس قسم کا بچہ خاکسار راقم الحروف تھا۔

اس زمانہ میں کوچہ چیلان گنتی کے چند ایک امیر گھرانوں کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر متوسط گھرانوں سے ہی آباد تھا حالانکہ مغل فرمانروا شاہجہاں کے زمانہ میں اس کی تمام تر آبادی رؤسا پر مشتمل تھی۔ شاہجہاں کے عہد میں جب اس شہر کی دارالسلطنت کی حیثیت سے از سرِ نو بنیاد پڑی تو یہ شاہجہاں آباد کے نام سے موسوم ہوا اس وقت اس علاقہ میں چالیس امرائے سلطنت کی عالیشان حویلیاں تھیں اور اس بناء پر یہ "کوچہ چہل امیراں" کہلاتا تھا۔جو زمانہ کی دست برد کے ہاتھوں بگڑتے بگڑتے کوچہ چیلاں کہلانے لگا۔ دراصل شاہجہاں نے جب آگرہ کو خیر آباد کہہ کر دلی کو پایۂ تخت بنانے اور وہاں ایک نیا شہر آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنی رہائش کے لئے وہ عالیشان محل تعمیر کرانے سے قبل جو لال قلعہ کے نام سے موسوم ہے اور آج بھی موجود ہے۔ شہر سے ملحق ایک وسیع قطعہ زمین منتخب کر کے اس پر ایک عارضی محل تعمیر کرایا تاکہ اس میں رہائش پذیر ہو کر وہ خود اپنی نگرانی میں انتہائی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قلعہ نما ایسا عالیشان محل تعمیر کرائے جو اپنی مضبوطی و پائیداری نیز شان و شوکت اور حسین و دلکشا ماحول کی وجہ سے جنت نظیر کہلانے کا مستحق ٹھہرے اور صدیوں قائم و دائم رہ کر اس کے نام کو مرنے کے بعد بھی زندہ و پائیندہ رکھے۔ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے بعد اس نے لال قلعہ کے دیوان خاص میں سنہری حروف میں یہ شعر کندہ کرایا۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس قلعہ نما جنت نظیر محل کی تعمیر سے قبل شاہجہاں نے جو عارضی محل تعمیر کرایا وہ زیادہ پختہ و پائیدار نہ تھا۔ بنایا جو گیا تھا محض عارضی رہائش کے لئے۔ نام تھا اس عارضی محل کا، کلاں محل۔ شاہجہاں کے اس عارضی محل کے قرب و جوار کے علاقہ میں چالیس امرائے سلطنت نے اپنی حویلیاں تعمیر کروائیں۔ اس پورے علاقہ کو "کوچہ چہل امیراں" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ میں نے 1920 میں اپنی پیدائش کے چند سال بعد جب ہوش سنبھالا تو کلاں محل کبھی کا منہدم ہو چکا تھا۔ اس کا صرف وہ حصّہ

باقی تھا جو محل کی حفاظت پر متعین فوجیوں کے لئے مخصوص تھا اور بہت وسیع و عریض صحن اور اس کے چاروں طرف بنی ہوئی بے شمار کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ان کوٹھڑیوں میں فوجیوں کے بجائے دھوبی آباد تھے اور اس زمانہ میں وہ دھوبیوں کا کٹڑا کہلاتا تھا۔عارضی محل کی طرح امرار کی اکثر حویلیاں بھی پیوند زمین ہو چکی تھیں۔اور ان کی جگہ متوسط گھرانوں کے چھوٹے بڑے مکانوں نے لے لی تھی۔اگرچہ دہلی کے اُس دور آخر کے اکثر ادبی اور مذہبی مشاہیر کوچہ چیلاں کے ہی رہنے والے تھے لیکن اپنی اقتصادی حالت کے اعتبار سے وہ رؤسائے شہر میں شمار نہ ہوتے تھے انہیں متوسط گھرانوں میں سے ایک گھرانہ حضرت حافظ وزیر محمد خاں محبّ اللہ شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے اور حضرت مولوی محمود حسن خاںؓ کے فرزند اکبر حضرت محمد حسن آسانؔ دہلوی کا بھی تھا جو کوچہ چیلاں کے چھتہ حکیم آغا جان میں آباد تھا۔محمد حسن آسانؔ دہلوی خاکسار راقم الحروف کے والد بزرگوار تھے۔اور ایک فرزند کی پیدائش کے بعد ان کے گھر میں پیدا ہونے والا چوتھا بچہ اور دوسرا فرزند تھا۔

گھر کا ماحول اور ابتدائی تعلیم:

گھر کا ماحول کئی پشتوں سے خالص دینی ماحول چلا آرہا تھا۔گھر میں ہر وقت دین ہی کا تذکرہ رہتا تھا۔بچوں کے کانوں میں ہمہ وقت دین ہی کی باتیں پڑتی تھیں۔خاندانی روایت کے بموجب خاندان کی بزرگ خواتین نے جن میں میری پڑنانی، نانی اور والدہ شامل تھیں مجھے نماز پڑھنی سکھائی نیز قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی سورتیں اور بعض مسنون دعائیں یاد کرائیں۔خاص طور پر والد محترمہ نے احمدی مسلمانوں اور غیر احمدی مسلمانوں میں فرق ذہن نشین کرایا اور یہ بات اچھی طرح دل میں بٹھائی کہ ہم احمدی مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ساری دنیا میں پھیلانے کا کام ہمارے سپرد کیا ہے۔میری ابتدائی تعلیم کا باقاعدہ آغاز چار پانچ سال کی عمر میں قاعدہ یسرنا القرآن سے ہوا۔اس زمانہ میں حضرت نواب محمد عبداللہ خان صاحبؓ نے دہلی میں ایک کارخانہ قائم کرایا تھا جس میں خورد و نوش کی اشیاء پیش کرنے والی کشتی یا سینی کی طرز پر بنی ہوئی لکڑی کی ٹرے اور اسی طرح کی بعض دوسری اشیاء تیار ہوتی تھیں۔آپ نے کارخانہ کا ایک نگران حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحبؓ کے برادر اکبر حضرت حافظ ملک محمد صاحبؓ کو مقرر فرمایا۔حضرت حافظ صاحبؓ اس زمانہ میں قادیان سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے اور کارخانہ کے ایک حصّہ میں ہی رہائش پذیر تھے۔کارخانہ ہمارے گھر کے قریب تو نہ تھا لیکن بہت زیادہ دور بھی نہ تھا۔حضرت والد صاحب کی درخواست پر حضرت حافظ صاحب نے مجھے پڑھانا منظور فرمالیا۔چنانچہ میں قاعدہ یسرنا القرآن پڑھنے روزانہ حضرت حافظ صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔چند ماہ میں قاعدہ یسرنا القرآن ختم کرنے کے بعد قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔گھر پر والدہ محترمہ سے ابھی تین سپارے ہی پڑھے تھے کہ پرائمری سکول کی پہلی جماعت میں داخل کر دیا گیا۔قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کا دور بعد میں مکمل کیا۔(جاری)

وقتِ دُعا

(راجہ محمد یوسف خان)

نہ روشن ضمیری نہ روشن نگاہی
وطن کے یہ رہبر ہیں کیا یا الٰہی
سیاست ہو جنکی شیاطیں کے طابع
نہیں اُنکی خاطر کوئی بھی مناہی
بٹھائے ہوئے ہوں جو پہلو میں مُخبِر
پریشان رہتے ہیں اُنکے سپاہی
ہے بحرِ ہوس میں مسلسل تلاطم
کھڑی بے کسوں کے ہے سر پر تباہی
یہ نادان پھر بھی بچھاتے ہیں پلکیں
نکلتا ہے جب ناز سے اَسپِ شاہی
ہیں رستوں سے واقف نہ منزل کے طالب
بصیرت سے عاری یہ ظلمت کے راہی
سرِ دار جاؤں گا میں سر اٹھا کر
عیاں ہو گی سب پر مری بے گناہی
اُنہیں بے حِسی کی سزا وقت دے گا
مرے حق میں دے گا مؤرخ گواہی
اُنہیں چھوڑ جائیگی ساری خدائی
یہ سطوت رہے گی نہ یہ کج کلاہی
اُنہیں خوار کر دے گی دونوں جہاں میں
تعیّش میں ڈوبی ہوئی بادشاہی
حقیقت میں یوسفؔ یہ وقتِ دُعا ہے
دِلوں پر ہے یاس و الم کی سیاہی

ہمیں بھی عہد کے انجام سے تھی دلچسپی

(چوہدری محمد علی مضطر)

صلہ کوئی تو سرِ اوجِ دار دینا تھا
نہیں تھا پھول تو پتّھر ہی مار دینا تھا
حریفِ دار بھی پروردگار! دینا تھا
دیا تھا غم تو کوئی غم گُسار دینا تھا
یہ وہ زمین تھی جو آسماں سے اتری تھی
یہ وہ حوالہ تھا جو بار بار دینا تھا
وہ اک حسین تھا اس عہد کے حسینوں میں
اُسے کسی نے تو کافر قرار دینا تھا
میں اپنی تنگیِ داماں کا عذر کیا کرتا
وہ دے رہا تھا، اسے بے شمار دینا تھا
تم اپنے آپ سے ملتے اگر اکیلے تھے
کڑا تھا وقت تو ہنس کر گزار دینا تھا
نہیں بتانا تھا لوگوں کو اپنا نام پتا
سر صلیب کوئی اِشتہار دینا تھا
وہ بے لحاظ بھی کہتا کبھی خدا لگتی
اُسے بھی زخم کوئی مُستعار دینا تھا
وہ برگزیدہ شجر لڑ رہا تھا موسم سے
کہ پھولنا تھا اُسے برگ و بار دینا تھا
ہمیں بھی عہد کے انجام سے تھی دلچسپی
کہ ہم فقیروں کا اُس نے ادھار دینا تھا
اٹھائے پھرتے ہو مضطرؔ! اُجاڑ گلیوں میں
یہ سر کا بوجھ تو سر سے اتار دینا تھا

میری ہستی کو محیطِ گوہرِ اسرار کر

دوزخِ ہجراں بدل دے جنّتِ دیدار میں
دانہء تسبیح پرو دے رشتہء زنّار میں

انتہائے جستجو دے انتہائے راز دے
تا ابد جو اُڑ سکے وہ شہپرِ پرواز دے

جگمگا دے میری دنیا جلوہء فاران سے
لہلہا دے میرا گلشن کوثرِ رضوان سے

میری اُلفت کو ایاغِ بادہء ایمان کر
میری ہستی کو چراغِ جادہء عرفان کر

میرے نالوں کو درائے کارواں کا سوز دے
میری آہوں کو فروغِ انجمن افروز دے

کاسہء دعوات بھر دے دولتِ دیدار سے
اے خدا مجھ کو بنا لے زمرہء ابرار سے

راہرو راہِ محبت کو متاعِ دید دے
میرے شوقِ آگہی کو مطلعِ انوار کر

(کلام مصلح الدین راجیکی مرحوم)

تصویر ادھوری رہتی ہے!

رب کائنات نے زندگی کو ایسا ڈیزائن کیا ہے کہ تمام تر کامرانیوں اور کامیابیوں کے باوجود زندگی کی تصویر ادھوری رہتی ہے کہیں نہ کہیں اس میں موجود کمی اور کجی کی ٹیڑھ ہمیں چبھتی ضرور رہے۔

مارچ کے آغاز میں بھارت میں دنیا کی مہنگی ترین پری ویڈنگ تقریبات نے پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا۔پاکستان کے سوشل میڈیا پر بھی اس کا کافی چرچا رہا۔ مکیش امبانی ایشیا کے امیر ترین کاروباری اور دنیا کے امیر ترین لوگوں میں گیارویں نمبر پر ہیں وہ ریلائنس گروپ کے بانی اور چیئرمین ہیں. اس تقریب میں مہمانوں کو ڈھائی ہزار ڈشز ناشتے، ظہرانے۔شام۔کی چائے عشائیے اور مڈنائٹ ڈنر کے طور پر پیش کی گئیں۔فلم انڈسٹری کے تمام سپر سٹار تقریب میں ناچتے دکھائی دیئے۔دنیا بھر سے نامور گلیمرس شخصیات کی موجودگی کی چکاچوند کے باوجود اس تقریب کا مرکز نگاہ دولہا انت امبانی تھے۔تقریب کے دولہا انت مبانی اس وجہ سے بھی خبروں کا موضوع رہے کہ وہ ایک خطرناک بیماری کا شکار ہیں۔جس میں وزن بے تحاشہ بڑھ جاتا ہے۔انت امبانی کو شدید قسم کا دمے کا مرض لاحق ہے جس کا علاج عام دوائیوں سے ممکن نہیں۔سو علاج کے لیے اسے سٹیرائیڈز دیئے جاتے رہے ہیں۔ان میں سٹیرائیڈز کی ایک قسم کارٹیکو سٹیرائیڈز تھی سٹرائیڈز کی یہ قسم وزن بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔اس سے انسان کی بھوک بے تحاشہ بڑھ جاتی ہے اتنی کہ وہ ہاتھی کی طرح کئی افراد کا کھانا اپنے پیٹ میں انڈیلنے لگتا ہے۔

اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیئے کہ کھربوں ڈالر کے اثاثوں کے مالک مکیش امبانی کا لاڈلا اور چھوٹا بیٹا ایک ایسی بیماری کا شکار ہے جس کے علاج کے لیے سٹیرائڈز کی تباہی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔اس کے بیٹے کو ہاتھیوں سے لگاؤ ہوا تو مکیش امبانی نے ایکڑوں پر پھیلا ہوا ہاتھیوں کا ایک سفاری پارک بنادیا۔اس سفاری پارک میں بیمار ہاتھیوں کے اسپتال، تفریح گاہوں، سپا اور مالش کا انتظام ہے۔خشک میوہ جات سے بھرے ہوئے سینکڑوں لڈو روزانہ ہاتھیوں کو کھلا دیئے جاتے ہیں۔

یہ صرف مکیش امبانی کے اپنے بیمار بیٹے کے ساتھ لاڈ کی ایک جھلک ہے۔مگر وہ اپنی تمام تر دولت کے باوجود اپنے بیٹے کے لیے مکمل صحت سے بھرا ایک دن نہیں خرید سکا۔انت امبانی نے تقریب میں ہزاروں مہمانوں کے سامنے اپنے دل کی بات کرتے ہوئے کہا کہ میری زندگی پھولوں کی سیج نہیں رہی بلکہ میں نے کانٹوں کے راستوں پر چل کر زندگی گزاری ہے

اس کا اشارہ اپنی خوفناک بیماری کی طرف تھا اس نے کہا کہ میں بچپن ہی سے ایک ایسی بیماری کا شکار تھا جس میں میری والدین نے میرا بہت ساتھ دیا۔جب انت امبانی یہ باتیں کر رہا تھا تو کیمرے نے ایشیا کے سب سے امیر ترین شخص مکیش امبانی کے چہرے کو زوم کیا اس کے گہرے سانولے رنگ میں ڈوبے خدوخال تکلیف سے پگھل رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے تکلیف اور بے بسی کے آنسو کہ وہ کھربوں ڈالر کے اثاثوں کے باوجود اپنے بیٹے کے لیے مکمل صحت سے بھرا ہوا ایک دن نہیں خرید سکا۔رب نے دنیا ایسی ہی بنائی ہے کہ تصویر ادھوری رہتی ہے۔اسی ادھورے پن میں ہمیں اس ذات کا عکس دکھائی دیتا ہے جو مکمل ہے!سو آئیں مکیش امبانی کی دولت پر رشک کرنے کی بجائے اپنی زندگی کی ادھوری تصویر پر اپنے رب کا شکر ادا کریں۔ جہاں ہیں جیسے ہیں خوش رہیں۔ خوشیاں بانٹیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں. سادہ زندگی گزاریں اور صدقات دیں۔دعا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحت و تندرستی والی فعال دراز عمریں نوازے آمین ثم آمین۔ (بشکریہ ڈاکٹر محمد اسلم ناصر آسٹریلیا)

رمضان پیکٹ

سال 2023 کے رمضان المبارک میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جرمنی کی طرف سے رمضان پیکٹس ربوہ میں مستحقین کی خدمت میں پیش کرنے کا تجربہ حوصلہ افزاء ثابت ہوا۔ الحمدللہ اس سال بھی اسے دہرایا گیا۔ بھائیوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جس کی بدولت 165 پیکٹس تیار کر کے گھروں میں پہنچائے گئے۔ اس پیکٹ میں روزمرہ کی خورد و نوش کی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ قربانی میں تمام حصّہ لینے والوں کے اموال و نفوس میں برکت ڈالے۔ آمین۔ ممبران نے ایک ملین روپے اس کارِ خیر کے لئے ٹکوسا کو پیش کیئے۔ اللہ تعالیٰ انکی قربانی کو قبول فرمائے اور انکی صحت و سلامتی اور درازی عمر عطا فرمائے۔ آمین

(شیخ منصور احمد۔ جنرل سیکریٹری ٹی آئی کالج اولڈ سٹوڈنٹس۔ جرمنی)

می لارڈ! یہ بچی چڑیل ہے

(از ابونائل۔بشکریہ ہم سب۔8اگست 2021)

سترہویں صدی میں سپین کے ایک گاؤں یانکی میں ایک بارہ سال کی لڑکی اس وقت کی مذہبی عدالت انکویزن کورٹ میں پیش ہوئی۔ اس بچی کا نام اربیکا تھا۔ اس بارہ سال کی بچی نے اس عدالت میں یہ بیان دیا کہ ایک خاتون انہیں دوسری عورتوں کے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ میں لے کر گئی۔ اور اس اجلاس میں ان سب عورتوں اور اس بچی کی ملاقات شیطان سے کرائی گئی۔ اس بچی کو اس شیطان کا حلیہ بھی بخوبی یاد تھا۔ اس نے بیان دیا کہ شیطان کے تین سینگ اور ایک دم بھی تھی۔

اور اس شیطان نے اس بچی کو کہا کہ وہ خدا، کنواری مریم اور اپنے والدین کا انکار کرے۔ اور اس خاتون نے بچی کو آمادہ کیا کہ وہ شیطان کی دم کے نیچے پیار کرے۔ اور پھر ان خواتین نے جشن منانے کے لئے رقص کیا۔ اور ان خواتین نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ ان سب خواتین نے جو کہ اصل میں عورتیں نہیں بلکہ چڑیلیں تھیں اسی تقریب میں شیطان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا۔

اس کے بعد ان چڑیلوں نے اپنے دانتوں سے مینڈکوں کی کھال اتاری اور ان مینڈکوں سے ایک پر اسرار شوربہ تیار کیا گیا۔

اس تہلکہ خیز گواہی کے بعد اس بچی نے 35 خواتین کے نام لئے جنہوں نے اس شیطانی اجلاس میں شرکت کی تھی۔ تاکہ انہیں قرار واقعی سزا دے کر انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ آپ یہ گواہی سن کر کیا کریں گے؟ ہنس پڑیں گے؟ یا اس بچی کو کسی

معالج کی طرف بھجوادیں گے۔ لیکن اس دور میں ان مذہبی عدالتوں میں بچوں کی ایسی گواہیاں بہت اہم سمجھی جاتی تھیں۔ بہر حال اس بچی کو ایسی عمدہ گواہی دینے پر معاف کر دیا گیا۔ چند سال بعد اس بچی نے اقرار کیا کہ یہ گواہی جھوٹی تھی اور اس کے رشتہ داروں نے اسے ورغلا کر یہ گواہی دلوائی تھی۔

اس دور کی مذہبی عدالتیں صرف بالغ خواتین اور مردوں میں چڑیلوں اور جادوگروں کو ڈھونڈنے کا کارنامہ سرانجام نہیں دیتی تھیں بلکہ بڑی باریک بینی سے بچوں اور بچیوں میں بھی جادوگروں اور چڑیلوں کو ڈھونڈنے کا فریضہ بھی ادا کرتی تھیں۔

چنانچہ اسی دور میں سپین کے اس سرحدی علاقے میں دوہزار کے قریب لوگوں پر اس قسم کے مقدمات قائم کیے گئے تھے اور ان میں سے تیرہ سو کے قریب چودہ سال سے کم عمر کے بچے تھے۔ اس سے ان مذہبی عدالتوں کی دور اندیشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اس بھیانک مرض کو جلد ہی پکڑ کر قلع قمع کر دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

<u>(Vande Woude, Olivia Louise,’’ In the Cathedral of the Devil: Young Witches of Navarre, 1608-1614‘‘(2020). Undergraduate Honors Theses. Paper 1529</u>

اب آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ صرف اسی علاقے میں بچوں پر ایسے مقدمات چلائے گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ نیک کام یورپ میں بڑے وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا۔ بچوں پر صرف اس قسم کے مقدمات ہی قائم نہیں کیے گئے تھے بلکہ انہیں بہت کامیابی سے چڑیلوں کو دریافت کرنے اور انہیں ان کے منطقی انجام یعنی زندہ جلانے تک پہنچانے کے لئے بھی استعمال کیا گیا تھا۔ کئی بچوں نے اپنے اساتذہ کو بھی سزا دلوائی۔ کئی بچوں کو جادوگری، چڑیل ہونے اور شیطان کے مرید بن جانے کی پاداش میں جیلوں میں بھجوایا گیا۔ سپین کے علاوہ ناروے، سویڈن اور جرمنی کی مذہبی عدالتوں نے بھی بچوں کو اس قسم کے جرائم کی پاداش میں سزائیں دیں۔

آج ہم ان واقعات پر اظہار افسوس کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں کس طرح کے اوٹ پٹانگ خیالات اور توہمات کے زیر اثر معصوم بچوں کو مذہبی الزامات لگا کر سزائیں دی گئی تھیں، کیسے تنگ نظر لوگ تھے۔ ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا تھا؟ لیکن کیا اس قسم کی حماقتوں سے ہمارا دامن مکمل طور پر صاف ہے؟ چند روز قبل ضلع رحیم یار خان میں ایک آٹھ سالہ ہندو بچہ ایک مدرسہ میں گیا اور اس مدرسہ کی لائبریری میں اس بچے کا پیشاب نکل گیا یا اس نے پیشاب کر دیا۔

اتنا بڑا جرم۔ یہ کوئی ایک دو سال کا بچہ تو نہیں تھا۔ آخر پورے آٹھ سال کا عاقل بالغ نوجوان تھا۔ پولیس بیچاری آخر کیا کرتی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو بیٹھ نہیں سکتی تھی چنانچہ انہوں نے اس آٹھ سال کے اس عاقل بالغ مرد کو گرفتار کر لیا اور دو روز حوالات میں رکھا اور مارا پیٹا بھی گیا۔ تاکہ آئندہ اسے پیشاب کرنے کی جرات نہ ہو۔ دو روز کے بعد کچھ مغرب زدہ لوگوں کے احتجاج کی وجہ سے مقامی عدالت نے اس آٹھ سال کے مجرم کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ بھلا ہماری غیرت یہ کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ ایک ہجوم نے جمع ہو کر موٹر وے بند کی اور پھر ایک فاتحانہ پیشقدمی کرتے ہوئے بھونگ میں مندر پر حملہ آور ہو گیا اور وہاں کی کھڑکیاں دروازے اور بتوں کو پاش پاش کر کے اپنے فرائض ادا کیے۔ پولیس وہاں پر موجود تھی لیکن منہ دیکھتی رہ گئی۔ آخر وہ آٹھ

سال کے بچے کا پیشاب نہیں روک سکے تھے تو اس ہجوم کو کیوں روکتے؟

پاکستان میں ایک آٹھ سال کے بچے کا پیشاب اتنا بڑا مسئلہ بن گیا کہ حالات پولیس کے قابو سے باہر ہو گئے اور رینجرز کو طلب کرنا پڑا۔ حکام کا موقف ہے کہ رینجرز کو پیشاب روکنے کے لئے نہیں بلکہ حالات پر قابو پانے کے لئے طلب کرنا پڑا تھا۔

اس واقعہ سے ہمارے وطن کی جو نیک نامی ہو سکتی تھی وہ ہوئی۔ آخر ملک کی سپریم کورٹ کو نوٹس لینا پڑا۔ اور گزشتہ جمعہ کو پنجاب کے چیف سیکریٹری اور آئی جی اور دوسرے حکام سپریم کورٹ میں پیش ہوئے۔ محترم چیف جسٹس صاحب اور جناب جسٹس قاضی امین صاحب نے اس صورت حال پر کچھ تبصرے کیے۔ تبصرے کیا تھے؟ حالات کا ماتم تھا۔

انہوں نے صوبہ کے اعلیٰ ترین حکام کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کو عقل سمجھ نہیں ہے۔ آپ اپنا ذہن استعمال نہیں کرتے۔ آپ میں سے کوئی پروفیشنل نہیں ہے۔ آپ میں کسی سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ آپ نے آٹھ سال کے بچے کو بند کر دیا۔ اس عمر کے بچے کو کیا علم کہ مسلمان کون اور ہندو کون۔ آپ کے اپنے بچے نہیں ہیں۔ آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ آٹھ سال کا بچہ تو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔ آپ بند کر دیتے ہیں بچے کو۔ آپ کو سمجھ میں نہیں آرہا۔

ممبر اسمبلی محترم رمیش کمار صاحب نے عدالت کو بتایا کہ اس سال اس قسم کے چھ سات واقعات ہو چکے ہیں اور حکومت کی بے عملی کی وجہ سے ایسے لوگوں کی ہمت بڑھ رہی ہے۔

صوبے کے اعلیٰ ترین حکام آخر کب تک یہ بے عزتی برداشت کرتے انہوں نے سپریم کورٹ کو اپنی کارکردگی سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ اب تک ہم نے کوئی گرفتاری نہیں کی۔ جب ہم کچھ کرنے لگتے ہیں تو متعصب طبقہ سوشل میڈیا پر شور مچا دیتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ پر بھی ایک مولوی صاحب نے لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ اور کچے کے علاقہ سے جرائم پیشہ لوگ جمع ہو گئے۔ گویا یہ دلیل انتظامیہ کی بے بسی کے عذر کے طور پر کافی تھی۔

اس صورت حال میں سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان کیا حل تجویز کرتے؟ جناب جسٹس قاضی امین صاحب نے اس بحث کے دوران تبصرہ فرمایا کہ تو کیا پھر بیرون ملک سے فوج بلوائیں؟ یہ تبصرہ کسی دو ٹکے کے صحافی کا نہیں۔ کسی مغرب زدہ بھارتی ایجنٹ یا لبرل کا نہیں۔ بلکہ ہمارے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے معزز جج صاحب کا ہے۔

اب ہم کیا اس دن کا انتظار کریں جب پاکستان کی عدالت میں کھڑے ہو کر کوئی وکیل یہ استدعا کرے۔ می لارڈ! یہ بچی چڑیل ہے۔ اسے زندہ جلانے کا حکم صادر فرمائیں۔

چاہئے کہ ہر ایک صبح تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے تقویٰ سے رات بسر کی اور ہر ایک شام تمہارے لئے گواہی دے کہ تم نے ڈرتے ڈرتے دن بسر کیا (کشتی نوح)

نعت

آسماں کی وسعتوں تک آپ کا قد دیکھ کر
جی اٹھا میں آج پھر سے سبز گنبد دیکھ کر

چاند کے ٹکڑے ہوئے سورج بھی گھنایا گیا
آمنہ کے لال کے اس نور کی حد دیکھ کر

میں نے یثرب کے سفر کا بس ارادہ تھا کیا
خود ہی سامان ہوگئے سب میرا مقصد دیکھ کر

رشک کرتے ہیں ستارے، جھومتی ہے کہکشاں
آسماں بھی جھک رہا ہے شانِ احمدؐ دیکھ کر

میں اسے چوموں گا جس کو آپ نے بوسے دئے
یہ خیال آیا تھا مجھ کو سنگِ اسود دیکھ کر

طاہر مجید (جرمنی)

“I am Still Alive” | Gaza Day 100

January 14th marked a hundred days. One hundred days of mass murder, of devastation, of a population slowly to being buried under the rubble of their once homes.

But what of the millions who are still alive and awaiting their fate? They look at the rubble knowing that the possibility of them being under it one day is very real, because the statistics are stacked against them one way or another.

According to the UN, as of 12 January 2024, 23,708 Gazans have been killed, 60,005 injured, 2.2 million are at risk of starvation, 939,000 at emergency levels, and there is zero access to clean water in the north. The math speaks for itself-in a population of 2.3 million, nearly every person is starving, injured or dead.

While the numbers alone are staggering, imagine for a moment what it's like to be one of those 2.3 million. Those of us hearing about Gaza in the news or reading about them can never truly understand their struggles, particularly because Gazans have mostly been cut off from the world - their voices seldom heard. Communications are frequently down, their borders are blocked, and channels for reaching the world outside or for the outside world to reach them, are practically non-existent.

It's for this very reason that we've been working to give a platform to the voices of Gaza, to let them speak for them- selves and for their truth to ring clearly above all other voices. As one can imagine, it hasn't been easy to make contact with those on the ground in Gaza. In a most startling reality, we found the easiest way to find people in Gaza was to search “I am still alive” on social media.

Gazans who can somehow manage to find cellular connection are posting “1 am still alive” every day, so that when a day comes they haven’t posted, the hope is that someone, somewhere will know of their fate.

We were finally able to reach Hamid, a Gazan who's been displaced four times and is now living in a tent with his family. Hamid shared some of the realities he and his family are facing in a candid interview.

> “My house has been destroyed, my family`s house has been destroyed, my relatives’ houses have been destroyed, our farms have been destroyed. All of our dreams have been destroyed. But we will continue fighting firmly to establish peace. We will establish peace.”

Hamid shared that neighbourhoods where homes have been destroyed are now tent cities. The phrase, unfortunately, is quite literal - the tents are all that's left.

> “We're in a tent and it gets very cold at night; it does not even have any of the basic necessities.”

Even those who live this reality every single day are no less shell-shocked by the truth of their new reality.

> "You see things that you would never have imagined seeing. You see people, families, even children sleeping in the open, in the cold, in the rain and you see children crying for food and water."

Most parents on a normal day might wake up worried about making break- fast for their children or getting them to school on time, but not the Gazans. They wake up and worry whether their children survived the night.

> "Whenever we wake up early in the morning, the first thing we think of is our children, death, and destruction. When we wake up we are afraid. We look for food to keep us and our children alive. We wake up in the midst of destruction and killing and we are in a state of fear and worry."

The brutal reality is that the possibility of death seems more probable than not, simply based on the carnage they've had to witness. Burying the dead is one of the ways family and friends are able to find closure or pay their last respects. But as Hamid describes it, even doing that much is not possible for many who have lost their loved ones.

> "Many of the bodies are blown to pieces. Many of the bodies end up remaining unknown and we can't figure out who it is. Some of them are completely lost (under the rubble). Some of them end up being in such tiny pieces that they can't be identified. I have many family members whom we know nothing about."

But as night falls in the tent cities, after a day of relentless bombings and shootings, the Palestinians still carry an inspirational mindset. Around the world, people have taken notice of the distinct resilience and patience shown by the Palestinians. Hamid's explanation of where such determination and the patience comes from is simple:

> "By the grace of Allah in the Gaza strip our faith is strong. God has commanded us that when we go through trials we have to remain patient and strong...It is required of us to encourage our children and families to also be patient, to not show any weakness in front of them, even though from the inside we are grieving and completely frightened."

The smiles of Palestinians radiate through the smoky rubble that Gaza has been reduced to. Yet the cycle never stops. Because as has become the reality in Gaza, there is always something to mourn.

> "One of the hardest things for us is when we are sitting together in a gathering and one of us receives a call saying that a member of your family is gone. Entire families have been annihilated. We'll be sitting and smiling, and then suddenly of us receives a call that his whole family is gone and then the entire aura changes to one of sorrow and sadness."

It's been no different for Hamid. He opened up about some of the family he's lost during the war. In a tone mixed with sorrow, pain and exhaustion, Ha T mid spoke about his cousin who had been bedridden for 22 years due to an accident. He was being helped by his brother to a hospital in northern Gaza when they were both struck by a missile and died.

> "This was one of the hardest things for me to lose this person who had been on bedrest for 22 years, gone, just like that."

The Israeli bombs certainly haven't discriminated. Hamid painfully recalled another cousin he lost: a doctor, who had graduated just last year. He had excelled in his studies and had a bright future of service to humanity ahead of him. When he heard the news that the Israeli soldiers had left the north, he went to check on his home. It turned out that this news was false, and this public servant was shot in the head and killed. With a tremor of pain, Hamid articulates a sentiment which can be applied to all innocent Gazans:

> "He was just a civilian; a doctor who had nothing to do with the war."

If the plight of Gazans has shown us anything, it's that survival certainly is relative. For those who have so far remained alive from the constant bombardment, life has been characterised by the struggle to find the basic needs of life.

> "There are huge shortages of everything... There is a shortage of food, water, medicine, let alone the fear and worry that we have. When you go looking for food you are in a state of fear that a missile will be dropped on you and at the same time you are thinking of everything; your family. So many things going on in your mind. If you hear a missile being launched, you immediately think of your family."

But Hamid hasn't accepted defeat, not even close. He exudes a determination to never give up no matter the circum- stances. It was this same determination that led him to collect donations from friends abroad and use the funds to do whatever he could to help those around him, by bringing them food, water, and whatever other basic necessities he could find.

> "Imagine when your family does not have all the basic necessities of life; water, food and medicine. Imagine once you received those things how happy you would feel. When you visit a family and you have a packet of supplies like milk for their children or some food for them, the joy that they feel is indescribable. It feels as if God's mercy has descended upon them from the heavens."

It's a glimpse into what the world needs at present to bring about peace: a spirit of helping one another, of respecting one another, because no level of enmity should ever lead to any amount bloodshed, let alone the horrendous state of affairs in Gaza. Even for people like Hamid who are facing the brunt this brutality, it's not about revenge, about peace.

> "We need governments that allow us to live, all Jews, Christians, and Muslims to live together in love, peace harmony. All of these religions are from God. We should all respect each other and we should all extend our hands peace."

.....

About the Author: Sarah Malik has a degree in Medical Biochemistry and is the recipient of the national American Chemical Society (ACS) award as the top student in the nation for her contribution to research and academic performance in Organic Chemistry. Sara is a Masters student studying. to become a Physician Assistant. She is a member of The Existence Project team and serves as the Executive producer of the "Power of Prayer" podcast.

(With thanks: The Review of Religions March 2024)

سائرن یا نیرو کی بانسری

(از محمد کولمبس خاں۔بشکریہ ہم سب۔مورخہ 28فروری 2024)

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت کے کالم نگار جناب محمد اکرم چوہدری صاحب نے مورخہ 27 فروری 2024 کو اپنے سائرن نامی کالم میں ”شہر بانو، عربی خطاطی اور ہمارے رویے!“ کے عنوان کے تحت جو دانش کے موتی بکھیرے ہیں ان پر تبصرہ ضروری ہو گیا ہے۔

آپ نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کر کے لکھا کہ:

”لوگوں نے سمجھا کہ خاتون شاید کہیں توہین مذہب کی مرتکب ہوئی ہیں“

اور بے بس خاتون کو چھڑانے کے لئے شہر بانو پولیس افسر کی کامیاب سعی کا ذکر کرنے اور اس مکروہ واقعہ کی شدید مذمت کرنے کے بجائے (جو ان کا اولین فرض بنتا تھا) بس معمولی سا یہ لکھ کر کہ:

”میں ایک مرتبہ پھر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بحیثیت قوم ہم جس انداز میں مذہبی معاملات پر ردعمل دیتے ہیں وہ ہماری مجموعی سوچ اور مذہب کے حوالے سے معلومات پر سوالیہ نشان ہے۔ہمارے مذہبی معیار دوسروں کے لیے اور ہیں جب کہ ہم اپنے لیے ہر وقت مذہبی معاملے میں نرمی کے تلاش میں رہتے ہیں اور دوسروں کے معاملے میں بہت ہی بے رحم ہو جاتے ہیں“

یہ صرف سوالیہ نشان ہی نہیں بلکہ رونے کا مقام تو ان کا کالم بھی ہے جس میں مذمت کرنے کے بجائے یہ جانتے ہوئے بھی کہ:

”لوگ بغیر کچھ سمجھے اکٹھے ہوتے ہیں اور جیسے جیسے جمع ہونے والوں کی تعداد بڑھتی ہے ویسے ویسے ہی سمجھ بوجھ، تحمل مزاجی اور شعور کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ نفرت اور بدلے کے جذبات حاوی ہوتے ہیں اور پھر لوگوں کی عقل جواب دے جاتی ہے اس کے نتیجے میں ایک سانحہ رونما ہوتا ہے، گھر جل جاتے ہیں، قیمتی جانوں کا ضیاع ہوتا ہے، بین الاقوامی سطح پر ہمارا (حقیقی۔ناقل) پر تشدد اور شدت پسند چہرہ دنیا کے سامنے جاتا ہے“

اور قاضی فائز عیسیٰ پر چند دن پہلے سے غلاظت پھینکنے کی مہم اور مذہبی شرپسندوں کی طرف سے ”تاثیر کی طرح کے انجام“ کی میڈیا پر دھمکیوں کے علم کے باوجود کالم نگار اس واقعہ کی ذمہ داری کے ضمن میں مذہبی بتوں کی قیادت کو نہایت مؤدبانہ توجہ دلاتے ہیں کہ:

”مذہب کے معاملے میں بالخصوص مذہبی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو تحمل مزاجی کا درس بھی دے اور

لوگوں کو اس معاملے میں ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کرنی چاہیے"

اور طرفہ تماشا یہ کہ اس نتیجہ پر پہنچ کر بھی کہ:

"یہ عربی خطاطی والا لباس پہنے صرف ایک خاتون اپنا چہرہ نہیں چھپا رہی تھی بلکہ وہ بحیثیت قوم ہم سب کا چہرہ بے نقاب کر رہی تھی"

البتہ محترم کالم نگار اس مذہبی بنیاد پر ہونے والے سانحہ فاجعہ پر صحیح تنقید کرنے والوں کو سخت سرزنش فرماتے ہوئے دین و اخلاق کی معراج تک رہنمائی کرنے والی ایک انوکھی منطق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس واقعے کے بعد لوگوں نے مذہبی شخصیات کو نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جتنے لوگ مذہبی شخصیات کو نشانہ بنا رہی ہے، تنقید کر رہی ہے۔ اگر اس میں سے مناسب تعداد بھی مذہبی معلومات کو بڑھانے اور مذہب کو سمجھنے پر وقت لگائیں تو یہ ممکن نہیں کہ بہتری نہ ہو۔"

صورتحال تصور کرنے سے:

1۔ پولیس کی حراست میں۔ 2۔ معافی مانگنے پر مجبور۔ 3۔ مظلومہ بے گناہ خاتون کی پریس کانفرنس۔ 4۔ دائیں بائیں براجمان علماء کہلانے والے۔۔ کے درمیان، یہ لڑکی جنگلی کتوں کے درمیان ایک ہرنی کا بچہ لگ رہی تھی۔ لیکن اس وڈیو کو دیکھنے کے بعد کالم نگار کا خون کھولنے کے بجائے یہاں پر "تحمل اور بردباری" سے بھرپور کالم نگار کے معصوم دل میں مذہبی۔۔۔ کے لئے احترام کے جذبات اچھلنے لگتے ہیں اور ان سے پھر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علماء کو تو ہر وقت برا بھلا کہنا سب اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ کبھی کوئی نہیں سوچتا کہ ہم انہیں کیا دیتے ہیں"

راقم کی تہذیبی مجبوری ہے کہ وہ الفاظ جن کا کالم نگار خود کو مستحق بنا چکے ہیں وہ زبان پر یا تحریر میں نہیں لا سکتا۔ یہ صیغہ جمع متکلم کو استعمال کرتے ہوئے "ہم" کے پردے میں سماج کو تو کوسنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن اس سو فی صد معصوم بچی پر اس لمحہ جو گزر رہی تھی اس کو ذرا تصور تو کریں۔ ان علماء کہلائے جانے والے، کالم نگار کے نزدیک "معزز مذہبی رہنما"، جن کے بیچ پھنسی سراسر بے گناہ عورت سے، ناحق معافی منگوائی جا رہی تھی اور یہ علماء۔۔۔ اس سے حظ اٹھا رہے تھے۔۔۔ جبکہ اس پر علماء۔۔۔ کے علاوہ ہر دردمند، حساس انسان ایک کربِ شدید محسوس کر رہا تھا۔

کالم نگار نے نہ اسے اپنی بچی سمجھا اور نہ اپنے دل و دماغ پر اس کی تکلیف کی ہلکی سی دستک تک محسوس کی۔ پھول سی بچی کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک انسانیت سے گرے ہوئے، جاہل اور غلیظ شخص کی قہر آلود نظروں میں ناحق گناہگار ٹھہرائی گئی تھی۔ ذرا تصور کیا جائے کہ خدانخواستہ اس کے لباس میں واقعی کوئی قرآنی لفظ لکھا نظر آجاتا تو اس کا خون تو مباح ہو گیا تھا۔

حیرت تو اس بات پر بھی ہے کہ سعودی حسینائیں کلمہ طیبہ لکھے ملبوسات بلکہ سوئمنگ لباس تک پہنتی ہے جو Amazon پر آج بھی فروخت ہو رہی ہیں وہ ان علماء یا کالم نگاروں کی نظروں میں نہیں آتیں۔ نیکی کے دعویدارو! اک نظر اُدھر بھی!

ہر وہ دانشور اور دینی رہنما جو اس واقعہ کی سچے دل سے مذمت نہیں کرتا اس کی اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے نمونہ کے ساتھ ذرہ بھر عملی ہم آہنگی نہیں ہے پھر بقول ڈاکٹر اسرار "اس دنیا میں۔ منافق ترین قوم پاکستانی" کے اس مغضوب رویہ کی ذمہ داری مولوی اور دانشوروں پر برابر پڑتی ہے

کالم نگار نے "ہم" کے پردے میں لکھا ہے:

"چونکہ ہم اپنی غلطیوں کو نظر انداز کرنے اور دوسروں کی غلطیاں نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں، اپنی خامیوں کو دور نہیں کرنا چاہتے اور دوسروں کو خامیوں کے ساتھ زندہ دیکھنا نہیں چاہتے، عدم برداشت اور شدت پسندی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ بات اگر صرف قرآن کریم کے حوالے سے ہی ہو اور اگر ہم اپنی زندگی کے معمولات دیکھیں تو یاد رکھیں ہم ہر وقت قرآن کریم کی آیات کے خلاف کام کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لعنت اللہ علی الکذبین۔ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت۔ انہ لایحب المستکبرین اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، انہ لایحب الخائنین۔ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

راقم کی کالم نگار کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے "ہم" کے بجائے "میں" سے مخاطب ہوں اور اپنی ہی بیان کردہ اخلاقی خلاف ورزیوں پر وہ سب سے پہلے خود توبہ کریں اور اس معصوم بچی سے بھی معافی مانگیں جس کے دہشت زدہ چہرے کے نقوش کو بھانپنے اور خوفزدہ دل کی دھڑکن کو محسوس نہ کرکے دینی و دنیاوی اخلاق سے گریز کیا ہے۔

میری اہلیہ صاحبہ کے خالہ زاد بھائی چودھری حفیظ احمد صاحب جو نیومالڈن، لندن میں رہائش پذیر تھے وہ سپین میں چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے کہ 4 دسمبر 2022 وہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے تھے اور 21 دسمبر کو ماڑدن کے قبرستان میں تدفین ہوئے۔ یہ ان کی یاد میں چند الفاظ کہے ہیں۔ 05.02.2023

——— :بھائی حفیظ کے نام ———

اے حفیظ! تجھ پر خدا کی رحمتیں ہوں بیشمار
کرتا تھا ہر یک تجھ کو دل سے حُب بیشمار
محفل کی تُو اک رونق اور چہرہ ہر دم خوشگوار
ہر آن تیرے چہرہ پہ تھی مُسکراہٹ بیشمار
سادگی و خاکساری تیرے چہرے سے تھی عیاں
یاد آئے گا تُو ہر گھڑی ہر فرد کو بیشمار
یہ دنیا ہے ہماری نہ ہی تھی تمہاری
ازل سے ہے جاری قدرت کا یہ کاروبار
معین! ہاتھ باندھے کرتا ہے خدا سے یہ التجاء
ملے تیری نیکیوں کا ثمر تجھے اُس جہاں بیشمار

چیف سیّد معین شاہ صاحب

——— چیف سید معین شاہ ———

دل سے کہی ہر بات قدر رکھتی ہے
عزت سے جو ہوتی ہے ملاقات، قدر رکھتی ہے
باتیں تو بہت ہوتی ہیں دل میں کرنے کو مگر
ہر وہ بات جو ہو بن کدورت، قدر رکھتی ہے
زمانے والے کہہ جاتے ہیں بات پہ بات
صاف دل سے نکلی ہو جو بات، قدر رکھتی ہے

کیا سائنسدان مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں؟

(از الم نگار۔ بشکریہ ہم سب۔ 5 اگست 2023)

کیا سائنس اور مذہب ایک دوسرے سے متصادم ہیں؟ اس سوال کو سنتے ہی دماغ میں گلیلیو کی تصویر آجاتی ہے۔ ایک طرف تنہا اور بے بس سائنسدان اور دوسری طرف چرچ کے عمائدین جنہوں نے زبردستی اس سے یہ اقرار کروا کر ہی دم لیا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایک وقت تھا جب دنیا کے ذہنوں پر مذہب کی اجارہ داری تھی۔ پھر سائنس کی ترقی کے ساتھ انسانوں میں سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت بڑھی اور انہوں نے ایک ایک کر کے مذہبی توہمات کو رد کرنا شروع کر دیا۔ اور آئندہ کی صدیوں میں مذہب سے وابستگی ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ سائنس کا راج قائم ہو گا۔ خاص طور پر رچرڈ ڈاکنس، لارنس کراس اور سیم ہیرس جیسی شخصیات اس نظریہ کی حمایت کر رہی ہیں۔

رچرڈ ڈاکنس اپنی شہرہ آفاق کتاب دی گاڈ ڈیلوژن میں یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ اس دور میں دنیا کے بہت کم سائنسدان خدا کے وجود کے قائل ہیں اور عمومی طور پر وہ لوگ مذہب کے نظریہ سے چمٹے رہتے ہیں جن میں ذہانت یا آئی کیو کم ہو اور ظاہر ہے کہ سائنسدان معاشرے کا ذہین طبقہ ہوتا ہے، اس لئے ان میں خدا کے وجود کے قائل لوگ بہت کم ہیں۔ لہذا رفتہ رفتہ مذہب سے وابستگی ختم ہو جائے گی۔ ایسے موضوع پر اس کتاب کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کتاب کا تیس زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے اور اس کی کروڑوں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس قسم کے موضوع پر بہت کم کتب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ سائنسدانوں کا ایک اور گروہ بھی ہے۔ اور یہ وہ گروہ ہے جو کہ شروع میں اتنے مذہبی نہیں تھے مگر جوں جوں ان کی سائنسی تحقیق کا سفر آگے بڑھا ان کے مذہبی رجحانات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مثال کے طور پر انسان کے ڈی این اے کا نقشہ تیار کرنے والے امریکی ماہر جینیات فرانسس کولنس بچپن سے ہی مذہب سے لاتعلق تھے۔ ماں باپ نے موسیقی سیکھنے کے لئے چرچ بھجوایا تو نصیحت کی کہ صرف موسیقی ہی سیکھنا۔ ان کے مذہبی وعظ کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا۔ اور فرمانبردار بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ یونیورسٹی میں پہنچے تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کوئی سائنسدان خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھ سکتا۔ لیکن چھبیس سال کی عمر میں ان کے خیالات نے پلٹا کھایا اور ان کے مذہبی رجحانات بڑھتے رہے اور جب سائنس کی دنیا میں ان کی شہرت عروج پر پہنچی تو انہوں نے ایک مسیحی مناد کا روپ دھار لیا۔

اسی طرح نظریاتی فزکس کا بڑا نام جان پولکنگ ہارن کی مثال ہے جنہوں نے باون سال کی عمر میں کیمبرج یونیورسٹی کو چھوڑ کر ایک مذہبی درسگاہ میں داخلہ لیا اور چرچ سے وابستہ ہو گئے۔ اور مذہب اور سائنس کے موضوع پر کئی کتب بھی لکھیں۔ پاکستان میں ہم نے زیادہ سائنسدان پیدا ہی نہیں کیے کہ ان کے نظریات پر تبصرہ کرنے کا جھنجٹ ہو۔ نوبل انعام کے مرحلہ تک ایک ہی سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام پہنچے اور ان کے مذہبی رجحانات سے سب واقف ہیں۔ چونکہ احمدی تھے اس لئے اسی بنا پر پاکستان میں معتوب ٹھہرے۔

اب اس بارے میں حقائق کا جائزہ لیتے ہیں۔ چونکہ سب سے زیادہ سائنسدان امریکہ میں کام کرتے ہیں۔ اس لئے اس پہلو سے تاریخی طور پر امریکی سائنسدانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے 1914 میں ایک ماہر نفسیات جیمز لیوبا کو یہ خیال آیا کہ یہ تحقیق کی جائے کہ مذہب اور خدا کے بارے میں سائنسدانوں کے نظریات کیا ہیں؟ ان کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیالیس فیصد سائنسدان

خدا کے وجود کے قائل ہیں اور بیالیس فیصد ہی یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسا خدا موجود نہیں جو انسانوں سے کوئی تعلق رکھے۔ باقی سائنسدان اب تک فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ کی عام آبادی کی نسبت سائنسدانوں میں خدا کے وجود کے قائل لوگوں کا تناسب کافی کم تھا۔

اس کے بعد کی دہائیوں میں سائنس کا اثر ورسوخ بہت بڑھا اور عمومی طور پر مغربی ممالک کے لوگ مذہب سے دور ہونا شروع ہوئے۔ اسی سال سے بھی زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد 1996 میں سائنس کے مورخ ایڈورڈ لارسن نے اس تحقیق کو دہرایا۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں یہ حیران کن نتائج سامنے آئے کہ 1914 اور 1996 کے درمیان امریکہ کے سائنسدانوں کے مذہبی رجحانات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چالیس فیصد سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں اور 45 فیصد کا کہنا تھا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔

اس کے بعد 2009 میں پیو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ایک تحقیق کی کہ اب سائنسدانوں کے مذہبی رجحانات کیا ہیں؟ 51 فیصد سائنسدانوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ خدا یا کسی ایسی بالا ہستی کے وجود کے قائل ہیں جو کہ پوری کائنات کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ 33 فیصد اس بالا ہستی کے لئے خدا کا لفظ استعمال کر رہے تھے اور 18 فیصد کا یہ کہنا تھا کہ وہ خدا کے قائل تو نہیں لیکن تمام کائنات میں ایک بالا ہستی موجود ہے جو کہ پوری کائنات کے لئے ایک روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ایسے سائنسدان جو کہ کسی بھی معنی میں خدا کے وجود کے قائل نہیں کل تعداد کا 41 فیصد تھے۔ جب مختلف طریق پر تفصیلی سوالات کیے گئے تو ان میں 17 فیصد کا کہنا تھا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل نہیں۔ گیارہ فیصد کا نظریہ تھا کہ یہ بتانا ممکن نہیں کہ خدا موجود ہے کہ نہیں اور بیس فیصد کہتے تھے کہ کسی خاص نظریہ سے وابستہ نہیں۔ دو فیصد نے ان سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کیا۔ اور باقی سائنسدان کسی نہ کسی مذہب کے ساتھ وابستہ تھے۔

ایک اور دلچسپ پہلو یہ سامنے آیا کہ جو سائنسدان 34 سال یا اس سے کم عمر کے تھے ان میں بیالیس فیصد ایسے تھے جو کہ کہتے تھے کہ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ اور چوبیس فیصد کائنات میں ایک بالا ہستی کے قائل تھے۔ اور ایسے سائنسدان جو کہ خدا کے وجود کا انکار کر رہے تھے کل تعداد کا 32 فیصد تھی۔ جب کہ بڑی عمر کے سائنسدانوں میں مذہب یا خدا کے تصور سے وابستہ لوگوں کا تناسب اس سے کم تھا۔

ان تینوں تحقیقات میں کیے گئے سوالات اور استعمال کیے گئے معیاروں کا فرق ضرور ہے لیکن ان تینوں کے نتیجہ میں یہ حقائق سامنے آتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ عام آبادی کی نسبت سائنسدانوں میں خدا کے وجود کے قائل لوگوں کا تناسب شروع سے کم رہا ہے کیونکہ امریکہ میں اب تک 83 فیصد لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں اور 12 فیصد کائنات میں موجود کسی بالا ہستی کے وجود کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ کہنا بھی غلط ہو گا کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران سائنسدانوں میں دہریت یا خدا کے وجود کا انکار کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور وہ مذہب کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں اس تناسب میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ پوری دنیا سے چوٹی کے سائنسدان امریکہ کا رخ کرتے ہیں کیونکہ وہاں پر سائنسی تحقیقات کی سہولیات سب سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ یہ تحقیقات امریکہ میں کی گئیں لیکن ان میں بڑی تعداد میں ان سائنسدانوں کی تعداد بھی شامل تھی جو کہ مختلف ممالک سے نقل مکانی کر کے امریکہ منتقل ہوئے تھے۔

اس کالم کے شروع میں فرانسس کولنس کا ذکر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں یہ دلچسپ تبصرہ کرتے ہیں کہ جب سائنس اور مذہب کے موضوع پر کوئی مکالمہ شروع ہو تو دونوں طرف سے کچھ لوگ اتنی بلند آواز میں بحث کرنے لگتے ہیں کہ اس شور میں حقائق کی آواز دب جاتی ہے۔

پنجاب توہین مذہب سے جڑی متشدد سوچ کا مرکز کیسے بنا؟

(از ندیم فاروق پراچہ، بشکریہ نیا دور۔ مورخہ 28 فروری 2024)

برصغیر کی تقسیم نے پنجاب میں بے پناہ تشدد کو جنم دیا۔ پاکستان کا حصہ بننے والے پنجاب میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہو گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جانے کے بعد فرقہ وارانہ تشدد کی باقیات اور 1946 کے بلند وبانگ اسلامی نعروں سے بھڑکنے والی آگ کا رخ احمدیوں کی جانب مڑ گیا۔

پُر تشدد ماضی کی بازگشت

سینٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز کی 2022 کی ایک تحقیق کے مطابق 1947 سے 2021 کے درمیان پاکستان میں توہین مذہب کے الزام میں 89 افراد کو قتل کیا گیا۔ اس عرصے کے دوران تقریباً 1500 الزامات لگے اور مقدمات درج ہوئے۔ ان میں سے 70 فیصد سے زیادہ کا تعلق پنجاب سے تھا۔ پاکستان کے دیگر صوبوں میں توہین مذہب کے الزامات اور قتل کے واقعات بہت کم ہیں۔ سندھ 173 الزامات اور قتل کے 9 واقعات کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے، اس کے بعد اسلام آباد 55 الزامات اور قتل کے 2 واقعات کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہے۔ خیبر پختونخوا میں 33 الزامات اور 6 قتل ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ بلوچستان، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں سب سے کم تعداد میں ایسے واقعات رونما ہوئے۔ مؤخر الذکر دونوں علاقوں میں کوئی قتل نہیں ہوا جبکہ بلوچستان میں صرف ایک شہری کو قتل کیا گیا۔ 1948 سے 1985 تک ملک میں توہین مذہب کے صرف 11 کیسز رپورٹ ہوئے اور محض 3 قتل ہوئے۔ یہ تب تھا جب ملک کے توہین مذہب کے قوانین میں موت کی سزا نہیں تھی۔ 1986 میں سزائے موت کے نفاذ کے بعد سے ان مقدمات کی تعداد میں 1،300 فیصد کا اضافہ ہوا۔

لیکن پنجاب توہین مذہب کے واقعات، تشدد اور ہلاکتوں کا گڑھ کیوں بنا ہوا ہے؟ اس دور میں بھی جب توہین مذہب کے قوانین بہت نرم تھے، یہاں 2 قتل ہوئے۔ دونوں مقتولین کا تعلق احمدیہ برادری سے تھا۔ پنجاب توہین مذہب سے متعلق تشدد کا مرکز بن چکا ہے۔ ماہر سیاسیات ڈاکٹر محمد وسیم اور کرسٹوف جیفرولٹ نے غور کیا ہے کہ کیا ان واقعات کا تعلق کسی بھی طرح سے 1947 میں تقسیم ہند کے دوران پنجاب میں پھوٹنے والے شیطانی "فرقہ وارانہ تشدد" سے تو نہیں ہے۔

یہ خطہ ایک طرف مسلمانوں اور دوسری جانب ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان وسیع پیمانے پر فسادات اور جھڑپوں کا مرکز تھا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے۔ کئی سرکردہ سخت گیر ہندو قوم پرست اور اسلام پسند تنظیموں کے ہیڈ کوارٹر پنجاب میں تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف تشدد میں ملوث ہونے کے علاوہ یہ تنظیمیں مرکزی دھارے کی سیاسی جماعتوں جیسے جواہر لال نہرو کی انڈین نیشنل کانگریس اور محمد علی جناح کی آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف بھی برسرپیکار تھیں۔ ہندو قوم پرست ایک 'ہندو راشٹر' یعنی ہندو ریاست بنانا چاہتے تھے جسے وہ سمجھتے تھے کہ 'سیکولر' کانگریس ایسی ریاست بنانے کو تیار نہیں۔ دوسری جانب بنیاد پرست اسلام پسندوں نے آل انڈیا مسلم لیگ پر ایک 'سیکولر' پارٹی ہونے کی وجہ سے حملہ کیا جو اسلامی ریاست بنانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ پنجاب میں اسلامی تنظیموں، جیسا کہ مجلس احرار، نے بھی مسلم لیگ پر الزام لگایا کہ "منحرف مسلمان" (یعنی شیعہ اور احمدیہ) بھی اس کی صفوں میں شامل ہیں۔

پنجاب میں اسلام پسندوں کی طرف سے لیگ پر لگائے گئے الزامات کو دور کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے پیغام میں تبدیلی لانے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہندوستان کے دیگر مسلم اکثریتی خطوں، جیسے مشرقی بنگال اور سندھ، اور ان خطوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں

تھے، مسلم لیگ نے مسلم قوم پرستی کا نعرہ لگایا اور یہ تصور علاقائی تھا۔ پارٹی نے قوم پرستی کے اس تصور کے معاشی اور سیاسی فوائد کو اجاگر کیا۔ لیکن پنجاب میں، اس حقیقت کے باوجود کہ 51 فیصد آبادی مسلمان تھی، مسلم لیگ کا پیغام بڑے پیمانے پر عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ، برطانوی ہندوستان میں 1946 کے صوبائی انتخابات کے دوران، مسلم لیگ کو پنجاب میں کچھ طاقتور زمیندار پیروں (روحانی رہنماؤں) اور علمائے کرام کو اپنے ساتھ ملانا پڑا۔ صوبے کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں، پیروں اور علمائے کرام کو پارٹی نے مسلم لیگ کے قوم پرست منشور سے قدرے دوری اختیار کرنے اور اس کے پیغام میں بنیاد پرست سوچ شامل کرنے کی اجازت دے دی۔

انہوں نے آئین پسند 'مغربی' خیالات کے حامی محمد علی جناح کو ایک ایسے نظریہ ساز کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا جو ایک 'نئی ریاست مدینہ' یا اسلامی ریاست بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور یہ ریاست پرہیز گار رہنماؤں اور شرعی قوانین کے ذریعے چلائی جائے گی۔ محمد علی جناح اگرچہ پاکستان بنانے میں کامیاب ہو گئے مگر ایسا کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوا۔ لیکن پنجاب کی مسلم آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ مکمل طور پر بنیاد پرست بن گیا۔ برصغیر کی تقسیم نے پنجاب میں بے پناہ تشدد کو جنم دیا۔ جب اس صوبے کا مغربی حصہ پاکستان میں شامل ہوا تو یہاں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہو گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ان کے جانے کے بعد فرقہ وارانہ تشدد کی باقیات اور 1946 کے بلند و بانگ اسلامی نعروں سے بھڑکنے والی آگ کا رخ احمدیوں کی جانب مڑ گیا۔ اس طرح، اس حقیقت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ 1953 اور 1974 کی دونوں احمدیہ مخالف پر تشدد تحریکوں کا مرکز و محور پنجاب تھا۔

1974 کی احمدیہ مخالف تحریک جس کا مرکز پنجاب تھا، نے پارلیمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ احمدیوں کو آئینی طور پر دائرہ اسلام سے بے دخل کرے۔ بنیاد پرست ذہنیت جو 1947 کے تشدد کے دوران پنجاب میں ابھری تھی، اس نے اپنی دیرپا توانائیوں کو مبینہ طور پر توہین مذہب کرنے والوں کی طرف موڑ دیا، خاص طور پر 1986 کے بعد۔

صوبہ پنجاب میں بریلوی سنی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ اس سنی ذیلی فرقے کو اس وقت الگ تھلگ ہو جانے اور عدم تحفظ کا شدید احساس ہوا جب جنرل ضیاء الحق کی آمرانہ دور کی 'اسلامائزیشن' پالیسیوں سے حریف سنی مکتبہ فکر کے ذیلی دیوبندی فرقے کو فائدہ پہنچنا شروع ہوا۔ اس کے رد عمل کے طور پر بنیاد پرست بریلوی رہنماؤں نے توہین مذہب کے قوانین کے 'دفاع' کو اپنا بنیادی مطالبہ قرار دیا۔ 2011 کے بعد پنجاب میں توہین مذہب سے متعلق تشدد اور ہلاکتوں کے واقعات میں خاص طور پر 10 گنا اضافہ ہوا۔ یہ وہ سال تھا جب بریلوی مکتبہ فکر کے ایک رکن ممتاز قادری نے گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو قتل کر دیا تھا۔ قاتل نے ان پر توہین مذہب کے قوانین پر تنقید کرنے کا الزام لگایا تھا۔

متشدد سوچ میں اضافے کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورنر پنجاب کے قاتل کو بہت سے لوگوں نے "ہیرو" قرار دیا۔ اس کے بعد پنجاب کے چند نامور سیاست دانوں نے بھی کھل کر اس کی تحسین کی۔ سلمان تاثیر کو جنوری 2011 میں قتل کیا گیا تھا۔ پنجاب میں اسی سال کے دوران توہین مذہب کے مزید 110 مقدمات اور الزامات رپورٹ ہوئے۔ 2014 میں یہ تعداد بڑھ کر 263 ہو گئی۔ 2020 میں ایک مرتبہ پھر ان واقعات میں اضافہ دیکھا گیا جب 231 ایسے واقعات رپورٹ ہوئے۔

اس صورت حال سے نکلنے کا کیا طریقہ ہے؟ بعض تشویش زدہ مبصرین مشورہ دیتے ہیں کہ چونکہ کوئی بھی ریاستی ادارہ یا حکومت توہین مذہب کے قوانین میں 1986 کے متنازعہ اضافے کو کالعدم قرار دینے پر تیار نہیں ہے، اس لیے کم از کم توہین مذہب کے جھوٹے الزامات لگانے والوں کے لیے یکساں طور پر عبرتناک سزاؤں کا اضافہ کر کے اس قانون کو قدرے "متوازن" بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن اسلام پسند جماعتیں اس معاملے پر بات بھی کرنے سے انکاری ہیں۔ یہ قوانین توہین مذہب سے متعلق تشدد کو معمول کی بات قرار دیتے

آئے ہیں۔ ہجوم کی صورت میں حملہ کرنے والے دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ ایسا کر رہے ہیں جو نا صرف خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے بلکہ مکمل طور پر جائز بھی ہے۔ اس نوعیت کا تشدد دیگر صوبوں میں نسبتاً کم ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان نے 1947 میں پنجاب کی طرح کا وحشیانہ تشدد نہیں دیکھا، جس کا اثر اور ذکر پنجاب کی سیاست پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ پنجاب 19 ویں صدی کے اواخر اور 20 ویں صدی کے اوائل میں بھی فرقہ وارانہ اور مذہبی جھگڑوں کا مرکز رہا ہے۔

پاکستان میں توہین مذہب کے قوانین

1930 کی دہائی تک مسلم دنیا میں توہین مذہب کے خلاف قانون کا کوئی حقیقی تصور نہیں تھا۔ ہندوستان جس پر 6 صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی، اس میں بھی ایسا کوئی قانون نہیں تھا۔ برطانوی نو آبادیاتی دور میں انگریزوں نے 1860 میں پہلی بار جنوبی ایشیا میں توہین مذہب کے قوانین متعارف کروائے تھے۔ یورپی خطوں میں اس طرح کے قوانین نافذ کرنے کی البتہ ایک طویل تاریخ رہی ہے۔ 14 ویں صدی کے فرانس میں سب سے پہلے توہین مذہب کے قانون کا تصور تشکیل دیا گیا تھا اور اسے نافذ کیا گیا تھا۔ برطانیہ نے 19 ویں صدی میں جب بھارت پر مکمل قبضہ کیا، اس وقت برطانیہ میں بھی توہین مذہب کا قانون موجود تھا۔ 1880 میں انگریزوں نے بھارت میں بظاہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بنیاد پرستی پر مبنی تنازعات کو قابو میں رکھنے کے لیے توہین مذہب کے چار قوانین متعارف کرائے۔ تاہم ان قوانین میں سزائے موت شامل نہیں تھی۔ 1927 میں اسلام کے خلاف توہین آمیز کتاب لکھنے پر ایک مسلمان کے قتل کے بعد ایک سخت قانون نافذ کیا گیا۔ بعد ازاں، انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھارت اور پاکستان دونوں نے اس قانون کو اپنا لیا۔ اس قانون کے مطابق توہین مذہب کی سزا میں ایک سال قید یا جرمانہ یا دونوں شامل تھے۔ 1980 کے بعد سے ان قوانین کا دائرہ پھیلایا گیا اور سزا کی شدت میں اضافہ ہوا۔ اس شدت کا منطقی نتیجہ 1986 میں اس جرم میں سزائے موت کے اضافے کی صورت میں بر آمد ہوا۔

مسلم دنیا میں توہین مذہب کے قوانین

7 ویں صدی سے 20 ویں صدی کے اوائل تک کوئی ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے پتہ چلے کہ کسی مسلم اکثریتی علاقے میں توہین مذہب کا کوئی قانون نافذ کیا گیا ہو۔ درحقیقت، علم الکلام کے بہت سے ماہرین صدیوں سے اسلام میں توہین مذہب کے تصور پر بحث کرتے آئے ہیں۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب، قرآن، توہین مذہب کو معمولی بات سمجھتی ہے اور قرآن میں اس جرم کی کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ 20 ویں صدی کے اوائل تک کسی بھی مسلم اکثریتی خطے میں توہین مذہب کے قوانین کبھی نافذ نہیں ہوئے۔ کسی مسلم اکثریتی ملک میں توہین رسالت کا قانون سب سے پہلے سعودی عرب میں نافذ ہوا۔ سعودی عرب 1932 میں انگریزوں کی حمایت سے وجود میں آیا تھا۔ اس نے اسلام کا ایک انتہائی قدامت پسند نکتہ نظر اختیار کیا۔ سعودی قوانین میں توہین مذہب کے جرم میں سر قلم کرکے موت کا حکم رکھا گیا ہے۔ لیبیا نے 1953 میں توہین مذہب کا قانون نافذ کیا۔ اس قانون میں جرمانے اور کچھ سال قید کی سزا مقرر کی گئی۔ انڈونیشیا توہین رسالت کے قوانین نافذ کرنے والا تیسرا بڑا مسلم اکثریتی ملک تھا۔ اس نے 1965 میں یہ قانون بنایا۔ 2008 میں ایک طاقتور اسلامی لابی نے انڈونیشیا میں احمدیوں کی سرگرمیوں کو کامیابی کے ساتھ محدود کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، اس اقدام کو قانون کا حصہ نہیں بنایا گیا تھا اور انڈونیشیا کے محض چند ہی صوبوں نے اسے اپنایا تھا۔

افغانستان نے 1976 میں "مذاہب کے خلاف جرائم" کے نام سے ایک قانون نافذ کیا۔ لیکن یہ 1978 اور 1988 کے درمیان افغانستان میں سوویت حمایت یافتہ حکومت کے دوران ختم ہو گیا۔ 1996 میں، طالبان کی پہلی حکومت کے دوران توہین مذہب کے سخت ترین قوانین کو نافذ کیا گیا جن میں موت کی سزا شامل تھی۔ یہ سزائیں 2001 میں طالبان حکومت کے خاتمے تک بر قرار رہیں۔

تاہم، امریکی حمایت یافتہ "جمہوری" حکومت کے دور میں، "مذاہب کے خلاف جرائم" کا قانون 2004 میں پھر سے بحال ہو گیا اور اس

مرتبہ اس میں توہین مذہب کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی۔ لیکن اگر کوئی سزا یافتہ شخص اپنے "توہین آمیز خیالات" واپس لے لے اور دو دن کے اندر توبہ کر لے تو اسے معاف کیا جا سکتا تھا۔ طالبان کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد آج کل افغانستان میں اس قانون کی کیا حیثیت ہے، اس بارے میں وثوق سے کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔

پاکستان اور بھارت نے توہین مذہب کے انہی قوانین کو اپنا لیا جو انگریزوں نے متعارف کرائے تھے۔ یہ قوانین نرم نوعیت کے تھے اور دونوں ملکوں میں شاذ و نادر ہی کبھی استعمال ہوتے تھے۔ اس قانون میں جو سزا مقرر کی گئی تھی وہ ایک سال قید یا جرمانہ تھی۔ بھارت نے اس قانون کو آج تک بر قرار رکھا ہے۔ پاکستان میں 1977 کی رجعت پسند فوجی بغاوت کے بعد 1980 میں توہین مذہب کے ارتکاب کی سزا میں مزید دو سال کا اضافہ کیا گیا۔ 1984 میں احمدیوں کے لیے اسلام کی تبلیغ یا خود کو مسلمان کہنے کے جرم میں 3 سال قید کی سزا کا اضافہ کیا گیا۔ انہیں 1974 میں پاکستان نے آئینی ترمیم کے ذریعے دائرہ اسلام سے خارج کر دیا تھا۔

1986 میں ایک آرڈیننس کے ذریعے توہین مذہب کے قانون میں سزائے موت کا اضافہ کیا گیا۔ یہ آرڈیننس 1991 میں ختم ہو گیا، لیکن ایک منتخب پارلیمنٹ نے اسے دوبارہ نافذ کر دیا۔ 1991 سے لے کر اب تک پاکستان کی جیلوں میں توہین مذہب کے الزامات کے تحت سب سے زیادہ لوگ قید ہیں۔ ایسے بھی بڑی تعداد میں واقعات ہوئے ہیں جن میں مشتعل ہجوم کی جانب سے یا انفرادی سطح پر لوگوں نے توہین مذہب کے الزام میں کئی لوگوں کو قتل کر دیا۔ جھوٹے الزامات لگانے والوں کو پاکستان کا قانون کوئی سزا نہیں دیتا۔

ایران میں توہین مذہب کے قوانین سب سے پہلے 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد متعارف کرائے گئے۔ ایران میں توہین مذہب کے مرتکب لوگوں کے لیے پھانسی یا فائرنگ سکواڈ کے ذریعے موت کی سزا رکھی گئی۔ ایران میں اب بھی یہ قوانین موجود ہیں جو اکثر سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ مصر نے 1981 میں توہین مذہب کا قانون نافذ کیا۔ اگرچہ اس میں موت کی سزا نہیں ہے، لیکن اس نے کھلے عام تشدد کے واقعات کو بڑھاوا دیا۔ متحدہ عرب امارات، قطر، الجزائر، عمان، اردن، ملائیشیا، صومالیہ، سوڈان، مراکش اور یمن کچھ دیگر ایسے مسلم ممالک ہیں جن میں توہین مذہب کے قوانین موجود ہیں۔ ان میں سے صرف یمن اور صومالیہ میں توہین مذہب کے قوانین میں سزائے موت رکھی گئی ہے۔ وسطی ایشیا اور یورپ میں مسلم اکثریت والے سابق کمیونسٹ ممالک میں سے صرف ایک قازقستان میں توہین مذہب کا قانون رائج ہے۔ جن مسلم اکثریتی خطوں میں توہین مذہب کے قوانین موجود ہیں ان میں سے ایران، پاکستان، لیبیا، افغانستان، صومالیہ اور یمن میں اس جرم کی سزا سزائے موت ہے۔ مغربی دنیا میں ایسے قوانین ختم ہو چکے ہیں یا منسوخ کیے جا چکے ہیں۔

ہم سرافراز ہوئے رُخصت، ہے آپ سے بھی اُمید بہت
یہ یاد رہے کس باپ کے بیٹے ہیں، کس ماں کے جائے ہیں

میری عقلمندی

کسی دانا شخص کا بایاں ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا۔ اس کی بیمار پرسی کے لئے اس کا دوست ہسپتال گیا:

دوست: "آپ کا بایاں ہاتھ کٹ جانے کا بڑا افسوس ہوا"

شکر اے مہرباں تیرا

منیر احمد باجوہ

میرے مولا کرم تیرا، یہ عاجز ناتواں تیرا
زمیں تیری، زماں تیرا، فلک تیرا، جہاں تیرا

تُو مالک ہے جہانوں کا زمینوں آسمانوں کا
ہر اک ذرہ دکھاتا ہے مکاں، اے لامکاں تیرا

میری ترسی نگاہوں پر ہے کی نظرِ کرم تُو نے
میں کیسے شکر کر پاؤں، اے مولا مہرباں تیرا

میں ساری عمر رکھوں سر، سجدۂ شکر میں اپنا
محبت ہی مجھے دے گا، اے پیارے آستاں تیرا

تیرے احساں کا شکرانہ ادا پھر بھی نہیں ہو گا
کرم ہی ہے جو ڈھانپے، اے کریمِ جاوداں تیرا

عنایاتِ کریمانہ تیری، بڑھ کر ہیں ماؤں سے
شُکر تیرا شکر تیرا، شکر اے مہرباں تیرا

تیری شفقت عنایت کا نہیں ثانی کوئی جگ میں
تصور کر نہیں سکتی ہے، مادر مہرباں تیرا

"میرا ہر ذرۂ تن جُھک رہا ہے التجا ہو کر"
سدا ہی حمد کرتی ہے یہ دھرتی، آسماں تیرا

میرے سارے پیاروں، خیر خواہوں پر کرم رکھنا
دُعاؤں سے رہے جو مانگتے فضل واماں تیرا

محبت میں عزیزوں نے ہے کر دی انتہا مجھ سے
انہیں شاداب رکھنا تُو، سجے یہ گلستاں تیرا

اُنہیں ڈھانپے رکھیں رحمت کے سایہ میں میرے مولا
جو پُر شفقت محبت سے بھرا ہو سائباں تیرا

تیرا ہی فضل لایا ہے تیرا ساقی زمانے میں
لنڈھاتا جام رُوحانی ہے دورِ مَیکشاں تیرا

ہزاروں آندھیاں لے کر خزاں آتی ہے گلشن میں
گُل و گلزار رکھتا ہے چمن کو باغباں تیرا

سدا تُو ساتھ ہی رہنا پیاروں کے، مرے پیارے
تیری نصرت سے چلتا ہے سالارِ کارواں تیرا

کوئی رخنہ نہیں پاتیں نگاہیں ہار جاتی ہیں
ہر اک پہلو سے کامل ہے جہانِ دِلکشاں تیرا

کبھی نہ چھوڑنا بے آسرا مجھ کو میرے پیارے
تحفظ ہی رہے حاصل مجھے، اے سارباں تیرا

میری روح تیرے قدموں میں سوالی بن کے آئی ہے
ملے اس کو سہارا عمر بھر، اے پاسباں تیرا

میں اس لائق نہیں کہ ہو سکوں میں سرخرو خود سے
بڑا ہی سخت ہوتا ہے پیارے امتحاں تیرا

بچانا ہر مصیبت سے، بچانا ہر محتاجی سے
عرض کرتا تیری دہلیز پر، یہ بیکساں تیرا

تیری الفت کے جُھولوں میں کٹی ہے زندگی میری
رہا یہ عمر بھر مستی میں سویا غافلاں تیرا

میں دنیادار کیڑا ہوں نہیں اوقات کچھ میری
نگاہیں تیرے در پر ہے، یہ رکھتا ناقصاں تیرا

عطا ہوتا رہے ہر آن چوکھٹ سے تیری مولا
عرض کرتا ہے تجھ سے ہی منیرِ بے زباں تیرا

اُڑنے والے جانور جو پرندے نہیں ہیں

(بشکریہ روزنامہ الفضل۔مورخہ 21مارچ2024)

آج ہم کچھ ایسے جانوروں کے بارے میں جانیں گے جو اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے پرواز کو برقرار رکھنے، اور گلائیڈنگ کے ذریعے پرواز حاصل کرتے ہیں۔

اُڑنے والی گلہری: ایک اڑن گلہری جو ایک میٹر سے زیادہ لمبی ہوتی ہے اور اس کا وزن تقریباً 2,5 کلو ہوتا ہے۔ جبکہ انہیں تبت کی اونی اڑن گلہری اور چینی صوبہ یونان کی اونی اڑن گلہری کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ گلہریاں چار ہزار ۸۰۰/ میٹر کی بلندی پر رہتی ہیں، جو کہ ماؤنٹ ایورسٹ کی آدھی بلندی بنتی ہے۔ ان کے دانت بہت ہی خاص ہیں اور یہ صنوبر کے باریک پتوں سے خوراک حاصل کرتی ہیں، جو کہ غیر معمولی خوراک ہے۔ ان کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کے درمیان ایک باریک جلد کی جھلی موجود ہوتی ہے جس کی مدد سے یہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر گلائیڈ کرتے ہوئے جا سکتی ہیں۔ ان کی لمبی دم انہیں گلائیڈ کرتے ہوئے توازن مہیا کرتی ہے۔ یہ ایک سو میٹر تک پرواز کر سکتی اور موڑ بھی مڑ سکتی ہیں۔ یہ عموماً سرخ رنگ کی ہوتی ہیں۔

اُڑنے والا سانپ: سانپوں کی ایک ایسی بھی قسم ہے جو اُڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سانپ اپنے جسم کو خوبصورت دائروں کی شکل میں موڑتے ہوئے خوبصورت پرواز کے ذریعے ایک درخت سے اُڑ کر دوسرے درخت تک جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ ۳۰/ میٹر لمبی چھلانگ بھی لگاتے ہیں۔

اُڑنے والا مینڈک: اڑنے والے مینڈک کے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان جھلی ہوتی ہے جو مینڈک کے چھلانگ لگانے کے بعد پیراشوٹ کی طرح کام کرتی ہے۔ جو ہوا میں گھومنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ درختوں میں بسیرا کرتے ہیں، ایک آسٹریلوی ریسرچر جوڈی رولی کے مطابق نئی قسم کے مینڈک کے پیٹ کا رنگ شوخ پیلا اور آنکھوں کا زیادہ تر حصہ سفید رنگ کا ہے، اور اس نسل کا قد تقریباً ۴ انچ ہے۔ اس قسم کے مینڈک ویتنام میں پائے جاتے ہیں۔

کاک ٹیل بیٹل: یہ پوشیدہ پنکھوں والا سیاہ بھنورے جیسی ہیئت رکھنے والا اصل میں رینگنے والا کیڑا ہے۔جو خطرے کی صورت میں اپنی دُم بالکل کسی بچھو کی مانند بلند کرلیتا ہے۔اس کے جسم کی لمبائی تقریباً پچیس تا اٹھائیس ملی میٹر ہوتی ہے۔اس کے پَر اس کے جسم کے پچھلے حصے کے اندر چھُپے ہوئے ہوتے ہیں،جو ضرورت کے وقت باہر آتے ہیں اور اُن کی مدد سے اُڑتا بھی ہے۔

ہشت پا راکٹ: یہ آکٹوپس یا ہشت پا سمندروں کی انتہائی گہرائیوں میں پایا جاتا ہے، جہاں روشنی بہت ہی کم ہوتی ہے۔یہ ہشت پا راکٹ کسی قسم کے خطرے کی صورت میں اپنے پیچھے لگے دو پَر کھول لیتے ہیں اور کسی میزائل کی طرح پانی سے باہر چھلانگ لگا دیتے ہیں۔یہ ہشت پا تقریباً تیس میٹر تک فضا میں رہنے کے بعد نیم دائرے کی صورت میں واپس پانی میں گرتے ہیں۔اس دوران ان کی رفتار ۲ء۱۱ر میٹر فی سیکنڈ تک ریکارڈ کی گئی ہے۔

اڑنے والی لومڑی (چمگادڑ): دیکھنے میں شکل لومڑی سے ملتی جلتی ہے لیکن یہ چمگادڑ کی ایک خاص نسل جو جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلات میں رہتی ہے۔اس کے پروں کا پھیلاؤ تقریباً ایک میٹر یا سوا تین فٹ ہے۔اڑن لومڑی ایک پھرتیلا اڑنے والا جانور ہے۔یہ اپنے بڑے پروں کو ہوا میں گھومنے کے لیے استعمال کرتا ہے، جس سے اسے جنگلوں میں پرواز کرتے وقت درختوں اور دیگر رکاوٹوں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔اپنے بڑے پروں کے علاوہ، اڑنے والی لومڑی کی بصارت بھی تیز ہے، جو اسے رات کے وقت کھانا تلاش کرنے میں مدد دیتی ہے اور زیادہ تر پھلوں اور پھولوں پر گزارا کرتے ہیں۔

اُڑتی اور جھرمٹ کی صورت میں تیرتی مچھلیاں: دنیا کے سمندروں میں مچھلیوں کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔ان میں کچھ پانی کی سطح سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر ۳۰ سیکنڈ تک فضا میں رہ سکتی ہیں۔لیکن یہ گلابی پروں والی مچھلیاں ۷۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ سفر کرتے ہوئے چار سو کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کر سکتی ہیں۔مچھلیوں کی ایک اور ایسی قسم جسے پروں والی مچھلی کہتے ہیں۔جو خطرے کی صورت میں اپنے سینے کے پٹھوں اور چھوٹے چھوٹے پروں کو استعمال کرتی ہوئی پانی سے باہر ایک بڑی چھلانگ لگاتی ہے۔یہ مچھلی جنوبی امریکا کے دریاؤں اور جھیلوں میں پائی جاتی ہے۔

اسی طرح سمندر میں بہت سی مچھلیاں مستقل یا عارضی طور پر بالکل پرندوں کی طرح ایک جھرمٹ کی صورت میں تیرتی ہیں، جیسے کہ پرندے اڑتے ہیں۔اور یہ مچھلیاں ایک دوسرے سے یکساں فاصلہ رکھتے ہوئے ایک ہی جیسی حرکت کرتے ہوئے تیرتی ہیں۔

ایٹم بم چلا دو۔ پھر کیا ہو گا؟

(از الم نگار۔ بشکریہ ہم سب۔ مورخہ 26 نومبر 2023)

غزہ میں خون ریزی جاری ہے۔ روزانہ انسانی المیوں کی نئی کہانیاں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اس تنازع نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے اور کئی ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جو کہ پہلے ابہام کی دھند میں پوشیدہ تھے۔ اس کالم میں ان میں سے صرف ایک پہلو یعنی ایٹمی ہتھیاروں کے ممکنہ استعمال پر تبصرہ کیا جائے گا۔

جب یہ جنگ شروع ہوئی تو اسرائیلی کابینہ کے ایک رکن امیچے الیاہو (Amichay Eliyahu) نے یہ بیان جاری کیا کہ غزہ کے مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ غزہ پر ایٹم بم گرا کر وہاں کی تمام آبادی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ صاحب انتہائی دائیں بازو کی سیاسی جماعت جویش پاور پارٹی کے لیڈر ہیں۔ جب اس بیان پر شور مچا تو ان صاحب نے بذریعہ ٹویٹ یہ وضاحت جاری کی کہ وہ محض تمثیلی زبان میں بات کر رہے تھے۔ خاکسار یہ سمجھ نہیں سکا کہ ایٹم بم کا تمثیلی استعمال کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیچے الیاہو اور ان جیسے خیالات کے صاحبان کا خیال ہے کہ جوہری بموں کی جنگ میں فوری طور پر تباہی ہو گی اور جو بدنصیب نشانہ بنیں گے وہ ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد باقی دنیا اپنی معمول کی زندگی گزارنا شروع کر دے گی اور ان جیسے سیاستدان اس بارے میں جدید سائنسی تحقیقات سے واقف نہیں ہیں۔

سابق امریکی صدر ہیری ٹرومین تاریخ کے وہ واحد سربراہ حکومت ہیں جنہوں نے ایٹم بم گرانے کے احکامات جاری کیے تھے۔ جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ ایٹم بم نے ہیروشیما کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا ہے تو اس وقت یہ صاحب ایک بحری جہاز میں سفر

کر رہے تھے۔ ٹرومین اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے خود جا کر جہاز کے عملہ کو یہ خوش خبری سنائی اور کہا کہ یہ دنیا کی تاریخ کا عظیم ترین لمحہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ٹرومین 'بھیانک ترین' اور 'عظیم ترین' کے درمیان فرق نہیں کر پا رہے تھے۔

اور اس واقعہ کے کئی سال بعد مئی 1950 میں ٹرومین نے یہ بیان دیا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا ان کا فیصلہ بالکل درست تھا اور اگر ضرورت پڑی وہ دوبارہ اس بم کا استعمال کریں گے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف ممالک نے ایٹم بم کا کامیاب تجربہ کر لیا اور دنیا میں ایٹم بموں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو سب کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ اگر اب بھرپور ایٹمی جنگ ہوئی تو کیا ہو گا؟

1970 کی دہائی تک دنیا کے چھ ممالک نے جوہری ہتھیاروں کا ایک ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور بڑی طاقتوں کے سیاستدانوں اور ماہرین میں یہ سوچ پنپ رہی تھی کہ یہ ضروری نہیں کہ جب جوہری ہتھیاروں سے جنگ ہو تو فریقین مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق محدود پیمانے پر ان بموں کا استعمال کریں اور صرف کچھ علاقے تباہ ہوں اور باقی ملک اور باقی دنیا محفوظ رہے۔ امریکہ کے وزیر دفاع نے 1974 میں امریکی کانگرس کو بریفنگ بھی دی کہ محدود ایٹمی جنگ کے کیا نتائج ہوں گے۔ اور سائنسی جرائد بھی اس ممکنہ صورت حال کا تجزیہ کر رہے تھے کہ اس سلسلہ میں فوری تباہی کے علاوہ تابکاری سے سات آٹھ لاکھ افراد کی موت ہو گی اور اس کا اس طرح ذکر کیا جاتا تھا جیسے انسانوں کی نہیں مولیوں اور گاجروں یا آلو پیاز کی بات ہو رہی ہو۔

(Sidney D. Drell and Frank von Hippe (1976) LIMITED NUCLEAR WAR. Scientific American 235 (5), 29-37)

1982 میں سائنسدانوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جو کہ یہ جائزہ لے کہ اگر اس وقت کی دو بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی بھرپور جنگ شروع ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں کتنا دھواں اور کتنی گرد فضا میں بلند ہو گی اور اس کے زمین کے موسم پر کیا ممکنہ نتائج ہوں گے۔ تین چار سال بعد کمپیوٹروں کی مدد سے سائنسدانوں کی ٹیم نے جو ممکنہ نتائج بیان کیے وہ پوری دنیا کے لئے ہوشربا تھے۔ ان کا تخمینہ یہ تھا کہ اگر دو بڑی طاقتیں اپنی جوہری اسلحہ کا چالیس فیصد بھی ایک دوسرے پر چلا دیتی ہیں، تو اس کی فوری تباہی سے جو انسانیت کا قتل ہو گا وہ تو ہو گا لیکن اس بعد جو بھیانک نتیجے نکلیں گے وہ فوری تباہی سے بھی زیادہ خوفناک ہوں گے۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ جب کسی مقام پر ایٹم بم پھٹتا ہے تو اس سے پورے علاقہ میں آگ لگتی ہے اور اس کے نتیجہ میں دھوں بلند ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ حساب لگایا گیا کہ اگر بھرپور ایٹمی جنگ ہوتی ہے تو اس کے نتیجہ میں اندازہ کتنا دھواں فضا میں بلند ہو گا؟ سائنسدانوں نے یہ حساب لگایا کہ اس کے نتیجہ میں دس کروڑ ٹن دھواں بلند ہو گا۔ یہ ایک محتاط اندازہ تھا۔ کچھ سائنسدانوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کے نتیجہ میں تیس کروڑ ٹن دھواں بلند ہو گا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر دس کروڑ ٹن دھواں بھی پیدا ہو تو اس کے زمین تک پہنچنے والی سورج کی روشنی پر کیا اثرات ہوں گے۔ حساب کتاب کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اتنے دھوئیں سے زمین تک پہنچنے والی روشنی کا 95 فیصد حصہ رک جائے گا گویا دن کے وقت بھی تاریکی کا راج ہو گا۔ چونکہ زمین پر خوراک کی پیدائش کا انحصار سورج کی توانائی پر ہے، اس لئے اس عمل سے زمین پر فصلیں، پھل وغیرہ پیدا نہیں ہوں گے۔ اور اس کا نتیجہ زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کے لئے تباہ کن ہو گا۔ گویا ایٹمی جنگ کے نتیجہ

میں آگ کے شعلوں سے فوری تباہی ہو گی اور اس کے بعد دھواں بلند ہو گا جو طویل المیعاد تباہی کا باعث بنے گا۔

یہ صرف ایک پہلو تھا۔ اگر اس قسم کی جنگ ہوتی ہے تو اس کے نتیجہ میں صرف دھواں ہی نہیں بلکہ گرد کی بہت بڑی مقدار فضا میں بلند ہو گی۔ رہا یہ سوال کہ گرد یا مٹی کی کتنی مقدار فضا میں بلند ہو گی۔ اس کا انحصار اس بات پر ہو گا کہ یہ ایٹمی ہتھیار کس قسم کی زمین پر چلائے گئے ہیں۔ سائنسی زبان میں دھواں تو بارہ کلو میٹر تک یعنی فضا کی قریبی تہہ ٹروپو سفیر Troposphere تک بلند ہو گا اور گرد کا طوفان اس سے اوپر کی تہہ سٹریٹو سفیر (Stratosphere) تک بلند ہو کر تباہی کا باعث بنے گا۔

ان کا مجموعی نتیجہ یہ نکلے گا کہ سطح زمین پر درجہ حرارت کی کمی ہو گی۔ اور ایک تخمینہ کے مطابق درجہ حرارت میں چالیس ڈگری سینٹی گریڈ تک کی کمی ہو سکتی ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں جوہری سردی (Nuclear Winter) کہا جاتا ہے۔ اگر صرف چند ڈگری کمی سے فصلوں پر مضر حضرات نکلتے ہیں تو اس صورت حال میں قحط کی کیا کیفیت ہو گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ طوفانوں اور طویل المیعاد تابکاری اثرات سے جو تباہی ہو گی وہ اس کے علاوہ ہے۔

(Richard P. Turco, Owen B. Toon, Thomas P. Ackerman, James B. Pollack and Carl Sagan (1984) THE CLIMATIC EFFECTS OF NUCLEAR WAR. Scientific American. 251 (2) , 33-43.)

2009 میں سائنسدانوں نے کمپیوٹروں کی مدد سے یہ تحقیق شروع کی کہ اگر نسبتاً چھوٹے پیمانے پر مثال کے طور پر برصغیر میں ایسے تصادم کی نوبت آجائے جس میں جوہری ہتھیاروں کا استعمال ہو تو کیا صورت حال پیدا ہو گی۔ اس تحقیق سے یہ خوفناک اعداد و شمار سامنے آئے کہ اگر محدود جوہری جنگ بھی ہو جس میں طرفین سو کے قریب جوہری بم استعمال کیے جائیں تو بھی دھوئیں کہ ایک بڑی مقدار فضا میں بلند ہو گی جو کہ دو ہفتہ میں پورے کرہ ارض پر محیط ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں سورج کی روشنی میں جو کمی ہو گی اس جو درجہ حرارت میں تھوڑی کمی ہو گی، دنیا کی زراعت پر اس کا اثر اتنا شدید ہو گا جو دنیا کو بدترین قحط سے دوچار کر دے گا۔ فضا میں اوزون کی لہر کو نقصان پہنچے گا اور موسمی تبدیلی سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

(Alan Robock &Owen Brian Toon (2010) Local Nuclear War, Scientific American 302 (1) 74-81)

یہ خوش فہمی ذہنوں میں نہیں پنپنی چاہیے کہ اگر کسی نے ایٹم بم کا استعمال کیا تو یہ صرف ایک دو بموں تک محدود رہے گا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر بھی سیاستدان یہی اندازے لگا رہے تھے کہ چند مہینوں کی بات ہے یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ ایسی جنگ کبھی محدود نہیں رہتی۔ خواہ اسرائیل کے حکمران ہوں یا بڑی طاقتوں کے یا پاکستان اور ہندوستان کے، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی بھی بیان دینے سے قبل اس کے بارے میں حقائق معلوم کر کے لب کشائی کیا کریں۔ ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ لفظوں کی جنگ حقیقی جنگ میں تبدیل ہوتی ہے اور محدود جنگ دیکھتے دیکھتے ایک عالمی جنگ کا روپ دھار لیتی۔ سائنسی حقائق یہی ظاہر کرتے ہیں کہ نسل انسانی کسی قسم کی ایٹمی جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

10.02.1994 ہفت روزہ بدر قادیان مصلح موعودؓ نمبر

حضورِ انور کا ایک اہم اور تاکیدی ارشاد

محترم ایڈیشنل وکیل التبشیر صاحب لندن اپنی سرکلر چٹھی T-19 / 9-1-94 میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی رنگین تصویر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کے ملاحظہ میں آئی تو آپ نے اس کو رنگین بنانے کے فعل پر کراہت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے بھی حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی رنگین تصویر بنائی ہے انہوں نے ناجائز حرکت کی ہے اور اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ فوراً یہ سلسلہ بند کریں۔ پہلے بھی میں نے سختی سے اِس سے منع کیا تھا۔ حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ میں کہاں رنگین تصاویر کا رواج تھا۔ کلر فلمنگ تو بہت بعد کی ایجاد ہے۔ اس لئے اصل جیسی تھی ویسی ہی رہنے دیں۔ اور ہرگز اصل کو نہ چھیڑا جائے۔ جس کسی نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصاویر بنا رکھی ہیں یا خرید کر گھروں میں لگائی ہوئی ہیں، یا البمز میں محفوظ رکھی ہیں وہ سب اُن کو تلف کر دیں۔ اور جو لوگ یہ کاروبار کر رہے ہیں وہ استغفار کریں کہ اُنہوں نے یہ حرکت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اور اب اس کا خمیازہ یہی ہے کہ جو بھی رنگین تصویر حضرت مسیح موعودؑ اُن کے پاس ہے وہ اُسے ضائع کر دیں۔ جو اصل ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے اس میں رنگ بھرنا نہ صرف تصنّع ہے بلکہ خطرناک حد تک اصل سے ہٹا دیتا ہے۔ اِس لئے یہ سلسلہ بند کیا جائے اور آئندہ ایسی حرکت کا اِعادہ نہ ہو۔"

جملہ اُمراء و صدر صاحبان اور احباب جماعت کی خدمت میں درخواست ہے کہ سیدنا حضور انور کے اِس اہم اور تاکیدی ارشاد پر فوری عملدرآمد کر کے ممنون فرمائیں۔ جَزَاکُمُ اللّٰہُ۔

ناظر تبلیغ واشاعت قادیان

ساٹھ سال پہلے "المنار" کا سرورق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

سالنامہ ۱۹۶۴ء

المنار

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

نگران اعلیٰ
شیخ محبوب عالم خالد۔ ایم اے

مدیر اعلیٰ
عطاء المجیب راشد

مدیران
سید شمشاد علی
مبارک احمد عابد ربانی

جلد ۱۴ ——— جولائی، اگست، ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء ——— شمارہ ۱

(جنید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

زباں بگڑی دہن بگڑا

(از جناب انتظار حسین۔بشکریہ نیوز ایکسپریس مورخہ 10 اپریل 2015)

خیبر پختون خواہ کی پارلیمنٹ میں ایک مرد کی خاتون کے ساتھ غیر پارلیمانی اور غیر اخلاقی زبان درازی پر نو سال پرانا کالم بطور نشر مکرر

صاحب "ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا"۔اس بیان پر ہمارے کان کھڑے ہوئے۔پوچھا "پہلے کب کہا تھا" اور کیا کہا تھا۔ارے صاحب یہی کہا تھا کہ:

؎ گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے ٹی وی چینلوں پر سیاسی بحثیں شروع ہوئیں تو جلد ہی بحث کا بازار گرم ہوتا چلا گیا اور جلد ہی شرفا کو محسوس ہونے لگا کہ زبان و بیان کا رنگ تہذیب و شائستگی کی حدوں سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔

اسی ہنگامہ میں آ گیا دھرنوں کا زمانہ۔پھر وہاں تو بات اتنی بڑھی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ان دنوں جذبات کا دریا چڑھا ہوا تھا۔اور جب جذبات کا دریا اس طرح چڑھے کہ اس میں غصے کی لہر بھی شامل ہو جائے تو پھر مت پوچھئے کہ جذبات کا چڑھا دریا کیا رنگ لاتا ہے۔زبانیں اس طرح کھلتی ہیں کہ بدزبانی شروع ہو جاتی ہے۔کتنی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ شرفا نے دانتوں میں انگلیاں دابیں اور تشویش سے کہا کہ یہ کیسی زبان میں سیاست بگھاری جا رہی ہے۔شرافت اور شائستگی کو تو یار و اغیار نے طاق میں رکھ دیا ہے۔

خیر وہ زمانہ تو گزر گیا اور جذبات کا چڑھا دریا بھی اتر گیا۔مگر پیچھے بہت گند بلا چھوڑ گیا:

؎ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

ایک طرف سے کچھ ایسا بیان آیا کہ یار احتجاجاً چلائے کہ خواتین کے بارے میں ایسی زبان کا استعمال۔ادھر سے جلدی ہی سوری سوری کہا گیا۔مگر ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلا ہوا گرا ہوا کلمہ واپس نہیں آیا کرتے۔اور ابھی پچھلے دنوں اسمبلی میں بھی یہ گونج سنائی دی کہ بولنے اور بیان دینے والے اب شریفانہ لہجہ میں بات ہی نہیں کرتے۔

یہ ردعمل نیک فال ہے۔کم از کم سیاسی حلقوں کو یہ احساس تو ہوا کہ سیاست کی گرما گرمی میں وہ حد سے اس طرح گزرے ہیں کہ شائستگی چہ کتیست کہ بیش مرداں می آید۔یہ کہ شریفانہ لہجہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ بات گالی گلوچ تک بھی پہنچ گئی تھی۔اس سے ہمیں خیال آیا کہ شاید اب سے پہلے بھی ہمارے معاشرتی معاملات میں کوئی ایسا رنگ آیا تھا کہ ہماری شاعری تک میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔میرؔ کا ایک شعر سنئے ؎

دیں گالیاں انھیں نے وہی بے دماغ ہیں میں میرؔ کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

اس پر ایک یار نے ٹکڑا لگایا کہ میرؔ نے کچھ زیادہ ہی شائستگی کا مظاہرہ کیا ہے ورنہ یہاں بے دماغ کی جگہ بدزبان کی ترکیب بھی استعمال ہو سکتی تھی۔خیر اس سے بڑھ کر ایک اور شعر سنئے۔اس میں ذرا کھل کر بات کی گئی ہے ؎

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب زباں بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

لیجیے ایک شعر استاد ذوق کا بھی سن لیجیے۔

؎ نہ جھاڑا غیر کو جو تجھ سے ہو کر جھاڑ لپٹا تھا مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدزباں باندھا

کسی پرانے شاعر کا ایک شعر اور اس ذیل میں سن لیجیے۔

گالی کو جانتا ہے سارا جہان گندی ؎ مت لا زباں پہ گالی ہو گی زبان گندی

ہاں ایک بات اور۔ ویسے تو زبان نے بہت گل کھلائے ہیں۔ مگر گالی نام کا گل عجب کھلایا ہے۔ اصل میں تو یہ نفرت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ نفرت کے اظہار کا اور غصے کے اظہار کا۔ مگر یہی گالی وقت موقعہ کے حساب سے پیار محبت کا کلمہ بھی بن جاتی ہے۔ اور ہاں ہنسی دل لگی کا کلمہ بھی۔ سو ذرا میر حسن کے اس شعر کو دیکھئے۔

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں ؎ کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

پھر کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ کسی کسی کے یہاں کوئی ایک گالی اس کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ یعنی موصوف نے پہلے گالی دی بلا کسی وجہ کے' بلا کسی تقریب کے۔ بس گالی بکی اور پھر جو بات کہنی تھی وہ بات کہی۔ اور ایسے بزرگ بھی دیکھئے گئے کہ گالیاں ہی ان کی مرغوب غذا بن جاتی ہیں۔ جب تک گالی نہ دیں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ ایک سکھ جو انگریزی بولنے کا شوقین تھا' اسے کسی بات پہ غصہ آیا تو اس نے انگریزی ہی میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ڈیم فول سے شروع ہوا اور ایسے کلمات جو گالی کے ذیل میں آتے ہیں بولتا چلا گیا۔ مگر اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ تب اس نے کہا موراوور moreovers ۔ اور پھر پنجابی میں ایک موٹی سی گالی دی۔ بس اس ایک گالی سے اس کی تشفی ہو گئی۔

اس سے یاروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ باقی دنیا بھر کے قصے قضئے آپ انگریزی میں بگھار لیجیے۔ مگر گالی اپنی زبان ہی میں سجتی ہے۔

تو یہ گالی عجیب قسم کی لسانی ایجاد ہے۔ بنیادی طور پر یہ نفرت کا اظہار ہے۔ نفرت کا اور غصے کا۔ یاں یوں کہئے کہ آدمی کو جب کسی شخص کے فعل پر یا رویّے پر غصہ آتا ہے اور نفرت کا اسے مظاہرہ کرنا ہوتا ہے اس طرح کہ شائستگی کو بالائے طاق رکھتا ہے اور منہ بھر کر گالی دیتا ہے یا گالیاں دیتا ہے اور دیتا چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اسی گالی سے گالی دینے والے کو اتنا شغف ہو جاتا ہے کہ وہ بات بے بات گالیاں دینے پر اتر آتا ہے۔ پھر اس کے لیے گالی کثیر الاستعمال چیز بن جاتی ہے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو گالی انسانی ضرورت ٹھہرتی ہے۔ اس لیے ہر زبان اپنے بولنے والوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے رنگ رنگ کی گالیاں بھی ایجاد کرتی ہے۔ اور یہ ایسی ضرورت ہے کہ یہاں شرافت اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

لو ہم نے تو گالی کے بارے میں اچھی خاصی منطق بگھارنی شروع کر دی۔ مگر بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں پر ختم ہونی چاہیے۔ مطلب کہنے کا یہ تھا کہ ہمارا معاشرہ زوال کے اس درجہ میں ہے کہ لوگوں میں برداشت کا مادہ ختم ہو چلا ہے۔ انسانیت جاتی رہی ہے۔ تعصبات اور نفرت کے جذبات کا بول بالا ہے۔ اس عمل میں ہم نے شائستگی اور وضعداری کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ یہ بھی خیال نہیں رکھتے کہ کیا مبتذل ہے اور تہذیب سے کتنی گری ہوئی بات ہے۔ ایسے میں گالی ہماری مرغوب جذباتی غذا بن جاتی ہے۔

تو کیا اس غیر مہذب اور انسانیت سے گری ہوئی عادت سے نکلنے کی کوئی صورت ہے۔ ہاں ہے اور ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہمیں احساس ہو جائے کہ یہ کتنا غیر شریفانہ عمل ہے۔

بات تو اسی کلام پر ختم ہونی تھی۔ مگر کیا کریں۔ دکھنی شاعری کے دور کا ایک بھلا سا شعر یاد آ گیا۔ ان خرابیوں سے پاک جن کا ابھی ذکر ہوا۔ تو وہ سن لیجیے۔

بامن کی بیٹی آج موری آنکھ منہ پڑی ؎ غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی

فربہ مزاج لوگ درکار ہیں جو سوچتے نہ ہوں

(از الم نگار۔بشکریہ ہم سب۔مورخہ 20۔مارچ 2024)

بہت سے مصنف دنیا کے منظر پر نمودار ہوئے اور مدھم ہو کر بجھ گئے اور اب انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ شیکسپیئر آج بھی زندہ ہے اس کے لکھے ہوئے ڈرامے اور ان میں درج مکالمے آج بھی انسانوں کے ذہن کو اسی طرح جھنجوڑ رہے ہیں جس طرح شیکسپیئر کے زمانے میں جھنجوڑ رہے تھے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ آج بھی انسان کی فطرت اسی طرح خود پسند ہے جس طرح شیکسپیئر کے زمانے میں تھی اور شیکسپیئر نے انسانی فطرت کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا۔

شیکسپیئر لکھتا ہے جنگ میں اپنی فتح کے بعد جب سیزر روم میں داخل ہوا تو پورا روم سیزر سیزر کے نعرے لگا رہا تھا۔ حاشیہ نشین سیزر کو تاج پیش کر رہے تھے کہ کسی طرح یہ صاحب اس تاج کو اپنے سر پر رکھ کر روم کے لوگوں کی دلی مراد پوری کر دیں۔ اور سیزر صاحب کمال انکسار سے لیکن کچھ بے دلی سے یہ پیشکش ٹھکرا رہے تھے۔ لیکن پورے روم میں مسکراہٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس گہما گہمی میں سیزر کی نظر اپنے دوست اور رومی جنرل کیسیس (Cassius) پر پڑتی ہے جو کہ سیزر کو دیوتا بنتا دیکھ رہا تھا اور دل ہی میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

سیزر کی ذہانت ملاحظہ ہو کہ اپنے ساتھ کھڑے انتھونی کو کہتا ہے کہ مجھے اپنے ارد گرد رکھنے کے لئے فربہ لوگ لا کر دو۔ جن کے چہرے چمک رہے ہوں جیسی رات کی نیند ہوتی ہے۔ ادھر کیسیس کو دیکھو اس کا چہرہ دبلا ہے اور بھوکا نظر آتا ہے۔ یہ سوچتا بہت ہے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کاش یہ کچھ اور فربہ ہوتا۔ مگر یہ پڑھتا بہت ہے۔ انتھونی تم ڈراموں کو پسند کرتے ہو مگر یہ ڈراموں کو پسند نہیں کرتا۔ مسکراتا بھی بہت کم ہے اور جب مسکراتا ہے تو اس طرح جیسے اپنے آپ پر طنز کر رہا ہو۔ (فربہ سے مزاج کے فربہ لوگ مراد ہیں۔ ایک نہایت دبلا شخص بھی مزاج کی فربہی کا شکار ہو سکتا ہے)۔ کیسیس مسکرا اس لیے نہیں رہا تھا کیونکہ وہ ان المیوں کو جنم لیتا دیکھ رہا تھا جنہوں نے اس دیوتا نما انسان کو اپنی شکنجے میں لے لینا تھا۔

آج کل پوری دنیا میں ایسے فربہ مزاج لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔ جو کہ مسکراتے رہیں اور سوچنے اور لکھنے پڑھنے جیسے فضول کاموں میں وقت ضائع نہ کرتے ہوں۔ کیونکہ آج کل صرف چند صاحبان اقتدار ہی نہیں بلکہ بہت سی اقوام میں ایسے بڑے بڑے گروہ پیدا ہو چکے ہیں جو کہ سیزر جیسے مزاج کا شکار ہیں۔

برطانیہ کی مثال لے لیں۔ دوسرے مغربی ممالک کی طرح یہ ملک بھی بزعم خود انتہا پسندی کے خلاف سینہ تان کے کھڑا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ جب غزا میں عرب آبادی کا قتل عام شروع ہوا تو برطانیہ میں بھی احتجاج شروع ہو گئے۔ حالانکہ احتجاج کرنے والوں کو اتنی سی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انتہا پسند تو صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اگر اسرائیل والے ہزاروں عرب باشندوں کو بھی قتل کر دیں تو وہ انتہا پسند نہیں ہو سکتے بلکہ وہ بیچارے تو اپنی جمہوری اقدار کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں۔

اب انہیں یہ کھڑکا لگا کہ جب انتہا پسندی کا مقابلہ کرنا ہے تو یہ تو فیصلہ کریں کہ انتہا پسندی کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے ایک جامع تعریف بھی مرتب کی گئی۔ اور اس میں یہ پخ بھی لگا دی گئی کہ ہر وہ شخص انتہا پسند ہو گا جو:

overturn or replace the UK 's system of liberal parliamentary democracy

یعنی اگر کوئی شخص آزاد برطانوی پارلیمانی نظام اور جمہوریت کو بدلنے کا خواہاں ہو یا اس معاملہ میں کسی دوسرے کی اعانت کرے تو وہ انتہا پسند ہو گا۔ اگر کوئی جماعت یہ مطالبہ کرے کہ برطانیہ میں پارلیمانی نظام کی بجائے، امریکہ کی طرز پر صدارتی نظام ہونا چاہیے تو وہ انتہا پسند ہو گی۔ ویسے یہی برطانوی آزاد پارلیمانی نظام تھا جس نے ایک وقت میں آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنا غلام بنایا ہوا تھا۔ اور دعویٰ یہ تھا ہم نے غلام تھوڑا بنایا ہے، ہم تو اپنا خون پسینہ ایک کر کے دنیا کو تہذیب سکھا رہے ہیں۔ لیکن برطانیہ کو اتنی سوچ بچار کرنے والے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں شخص یا گروہ انتہا پسند ہے۔ یہ فیصلہ ان کے وزیر صاحب بہادر فرمائیں گے۔ تا کہ کسی عدالت میں کچھ ثابت کرنے جھنجٹ ہی نہ رہے۔

برطانیہ اپنی پارلیمانی اقدار کی حفاظت کر رہا تھا تو ہم پاکستانی اپنے ملک کی دینی اقدار کی حفاظت کے لئے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ خاکسار نے گزشتہ کالم میں عرض کی تھی کہ چیف جسٹس صاحب نے اپنے ایک فیصلہ میں پاکستان میں مذہبی آزادی کی صورت حال بہتر بنانے کے لئے چند پیراگراف لکھ دیے تو ایک طبقہ ان کے گرد ہو گیا۔ مذہبی طبقہ نے تو ان پر تیر چلائے، فیصل آباد میں پاکستان میڈیکل کونسل نے ایک مصروف سڑک پر جو بینر لگائے ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

1۔ چیف جسٹس کا قادیانیت کے حق میں فیصلہ پاکستانی آئین سے انحراف ہے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن فیصل آباد

2۔ قادیانیت ایک ناسور ہے۔ مسلمان اسے پھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن فیصل آباد

3۔ چیف جسٹس پاکستان کا فیصلہ قادیانیت کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن فیصل آباد

جب اس عاجز نے پاکستان میڈیکل کونسل کے مرکزی دفتر سے رابطہ کیا تو ان کا کہنا تھا کہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ بینر کس نے لگائے ہیں۔

دنیا کے وہ دو تین ممالک جن میں سب سے زیادہ نوزائیدہ اور پانچ سال سے کم عمر بچے موت کا شکار ہوتے ہیں، ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ لیکن پاکستان میڈیکل کونسل کو اس کی فکر نہیں۔ دنیا کو وہ دو ممالک جن سے پولیو ختم نہیں ہو سکی، ان میں پاکستان کا نام بھی ہے لیکن پاکستان میڈیکل کونسل کو اس کا غم نہیں۔ اگر فکر ہے تو اس بات کی کہ چیف جسٹس کا محاسبہ کس طرح کیا جائے۔ اور وہ بزعم خود پاکستانی آئین کی حفاظت کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب ہم اس راستہ پر چل پڑے تو بھارت کس طرح پیچھے رہ جاتا۔ گجرات کی ایک یونیورسٹی میں مختلف ممالک کے مسلمان طلبا نماز پڑھ رہے تھے۔ یونیورسٹی کے ہندو طلبا نے ان پر ڈنڈوں اور پتھروں سے حملہ کر دیا اور 'جے شری رام کی' کے نعروں کی ساتھ ان کی پٹائی کر ڈالی۔ جب دنیا میں شور مچا تو یونیورسٹی کے وی سی صاحب بہادر نے بیان دیا کہ ان غیر ملکی طلبا کو ہماری ثقافت کی حساسیت کا احساس نہیں تھا۔ ہم ان کو ان کو اس بارے میں ٹریننگ دیں گے۔

ان صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ پہلے ہندوستانی طلباء کو کچھ تمیز سکھا دیں۔ اور انہیں دوسروں کے مذہب اور ثقافت کا احترام سکھائیں۔ اسی طرح اسرائیل کے فوجی اور ان کے سیاستدان یہ دلیل دے رہے ہیں اگر ہم نے غزا میں عرب بچوں کا قتل کر دیا تو کیا ہوا۔ کل کو انہیں بچوں نے جوان ہو کر دہشت گرد بننا تھا۔ ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کا حساب صاف کر دیا۔ اس وقت دنیا کا ہر ملک اپنی تہذیب اور اقدار کی جے جے کار کرنے میں مشغول ہے۔ اور ہر گروہ میں ایسے فربہ مزاج لوگ موجود ہیں جنہیں سوچنے اور پڑھنے لکھنے جیسے فضول کاموں کی فرصت نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل اسی طرح کا ماحول پیدا کیا گیا تھا اور اس دھینگا مشتی کا جو انجام ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

ایہام گوئی

(آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا سے)

ایہام سے مراد یہ ہے کہ شاعر پورے شعر یا اس کے جزو سے دو معنیٰ پیدا کرتا ہے۔یعنی شعر میں ایسے ذو معنی لفظ کا استعمال جس کے دو معنی ہوں۔ایک قریب کے دوسرے بعید کے اور شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو ایہام کہلاتا ہے۔ بعض ناقدین نے ایہام کا رشتہ سنسکرت کے سلیش سے بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔لیکن یہ درست نہیں کیونکہ سلیش میں ایک ایک شعر کے تین تین چار چار معنی ہوتے ہیں جب کہ ایہام میں ایسا نہیں ہوتا۔

اردو شاعری میں ایہام گوئی

ولی دکنی کا دیوان 1720ء میں دہلی پہنچا تو دیوان کو اردو میں دیکھ کر یہاں کے شعراء کے دلوں میں جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا اور پھر ہر طرف اردو شاعری اور مشاعروں کی دھوم مچ گئی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ولی کے تتبع میں شمالی ہند میں جو شاعری شروع ہوئی اس میں سب سے نمایاں عنصر "ایہام گوئی" تھا۔اس لیے اس دور کے شعراء ایہام گو کہلائے۔اس دور کی شاعری میں ایہام کو اس قدر فروغ کیوں حاصل ہوا۔ آیئے ان اسباب کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسباب

ایہام گوئی کے بارے میں رام بابو سکسینہ اور محمد حسین آزاد دونوں کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدائی شاعری میں ایہام گوئی کے رجحان کا ایک اہم سبب ہندی دوہوں کا اثر ہے۔ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے نزدیک اس زمانے میں فارسی شعراء کا دربار اور شعر و ادب کی محفلوں میں بہت اثر تھا۔ یوں بھی ادب میں دہلی والے فارسی روایات برتتے تھے۔ اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ متاخرین شعرائے فارسی کے واسطے یہ چیز عام ہوئی ہو۔اس سے واضح ہوا کہ ایک سبب ایہام گوئی کا ہندی دوہے ہیں اور دوسرا سبب متاخرین شعرائے فارسی سے متاثر ہو کر اس دور کے شعراء نے اپنی شاعری کی بنیاد ایہام پر رکھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ہر بڑے شاعر کی طرح دیوان ولی میں بھی بہت رنگ موجود تھے۔خود ولی کے کلام میں ایہام گوئی کا رنگ موجود ہے۔ اگرچہ ولی کے ہاں یہ رنگ سخن بہت نمایاں نہیں لیکن ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق ولی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چنا۔ آبرو، مضمون، ناجی اور حاتم ولی نے ایہام کے رنگ کو چنا۔یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں ایہام کی ایک بڑی وجہ ولی کے کلام میں موجود ایہام گوئی کا رنگ بھی تھا۔

ان تین اسباب کے علاوہ ایہام گوئی کے رجحان کا ایک اور اہم سبب محمد شاہی عہد کے درباری اور مجلسی زندگی تھی۔یہ دور برصغیر کا نہایت بحرانی دور رہا۔ محمد شاہ گو بادشاہ تو بن گیا تھا لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود نہ تھیں جو گرتی ہوئی حکومت کو سنبھال سکتیں۔یوں اس نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے عیش و عشرت اور رقص و سرور کا سہارا لیا۔یوں طوائفوں اور بھانڈوں کی محفلیں جمنے لگیں۔اس قسم کی مجلسی فضا میں جہاں حسن و عشق کا تصور انفرادی کی بجائے اجتماعی جذبے کی صورت اختیار کر لے تو پھر اس

کے اظہار کے لیے ایسے پیرائے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ایہام، رعایت لفظی، ذو معنی اور پہلو دار معنی، ضلع جگت، چٹکلے اور پھبتیاں وغیرہ ایسی محفلوں میں سب کو مزا دینے لگیں۔ یوں اس دور کے تہذیبی موسم اور معاشرتی زمین ایہام گوئی کے پھلنے پھولنے کے لیے نہایت مناسب تھی۔

مختصراًان اسباب کو یوں بیان کرسکتے ہیں کہ ہندی دوہوں کا اثر، فارسی کے شعرائے متاخرین کی روایت دیوان ولی میں ایہام گوئی کے رنگ کی موجودگی اور محمد شاہی عہد کی مجلسی اور تہذیبی زندگی ایہام گوئی کے رجحانات کے عام کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔

ایہام گو شعرا

ایہام گوئی کے سلسلے میں آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، فائز اور حاتم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آبرو   شاکر ناجی   شرف الدین مضمون   مصطفٰے خان یک رنگ   شاہ حاتم

اردو شاعری پر اثرات

ایہام گوئی کی بدولت شاعری پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات پڑے۔ ایہام گویوں کی کوشش سے سینکڑوں ہندی اور مقامی الفاظ اس طور سے استعمال ہوئے کہ اردو زبان کا جزو بن گئے۔ نہ صرف الفاظ بلکہ ہندی شاعری کے مضامین، خیالات اور اس کے امکانات بھی اردو شاعری کے تصرف میں آ گئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ایہام گوئی کے رجحان سے جہاں اردو زبان پر مثبت اثرات مرتب ہوئے اس کے کچھ منفی اثرات بھی ظاہر ہوئے۔

جب ایک مخصوص فضا میں ایہام کا رواج ہوا جہاں الفاظ کی بازیگری کو استادی سمجھا جانے لگا تو شاعری صرف الفاظ کے گورکھ دھندے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لفظ تازہ کی تلاش میں متبذل اور بازاری مضامین بھی شاعری میں گھس آئے۔ نیز جب شاعر لفظوں کو ایہام کی گرفت میں لانے کی کوشش میں مصروف رہے تو پھر شاعری جذبہ واحساس سے کٹ کر پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے اور یہی حال اس دور میں شاعری کا ہوا۔

ایہام گوئی کے خلاف ردعمل

ایہام گو شعراء کے بعد جو نیا دور شروع ہوا اس میں مظہر، یقین، سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ایہام کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ اس دور میں ان لوگوں نے ایہام گوئی کی بندشوں کو شدت سے محسوس کیا ان کے سبب خیالات کے اظہار میں رکاوٹ آ جاتی تھی۔ یوں ایہام گوئی میں زیادہ شعر کہنا مشکل تھا۔ لیکن ایہام گوئی ترک کرنے کے بعد شعراء کے دیوان خاصے ضخیم ہونے لگے۔ شعراء کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ اس نئے دور میں ایہام گوئی کے خلاف اس قدر احتجاج کیا گیا کہ شاہ حاتم جو ایہام گو شاعر تھے انھوں نے اس روش کو ترک کر دیا اور اپنے دیوان سے ایہام کے شعر نکال دیئے۔

ایک اہم اعلان

برادرانِ کرام!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

مشرقی یورپ اور مراکش کے کے بعد اور اب Kazakhstan کیلئے ہمارے تیسرے ٹور کی انٹرنیشنل فلائٹ کی Booking ہو گئی ہے الحمد اللہ۔ اس کے لئے محترم سید شکیل احمد صاحب نے بڑی محنت کی ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ہماری روانگی فرینکفرٹ ائیرپورٹ سے 28 مئی 2024 دو بج کر پچیس منٹ (14:25) بعد دوپہر انقرہ کیلئے ہو گی۔ یہ فلائٹ سوا تین گھنٹے کی ہو گی۔ انقرہ سے روانگی دس بج کر پچپن منٹ (10:55) پر Kazakhstan کے لئے ہو گی Almaty ۔ شہر ہم صبح سوا چھ بجے (6:15) پہنچیں گئے۔ انشاء اللہ یہ سفر چار گھنٹے پینتالیس منٹ کا ہو گا۔ یہاں پر چار دن کا قیام ہو گا۔ یہاں سے دارالحکومت (آستانہ) Astana جائیں گے۔ وہاں قیام کے بعد ہماری واپسی ترکی کے شہر استنبول کی طرف پانچ جون 2024 کو ہو گی۔ استنبول میں دو یا تین دن کا قیام ہو گا وہاں سے فرینکفرٹ واپسی ہو گی۔ انشاء اللہ۔ اس ٹور میں انیس (19) دوست شامل ہیں۔

ہم نے Kazakhstan جانے اور واپسی استنبول کی ٹکٹ بک کروالی ہیں اگلے مرحلہ میں Almaty سے Astana اور استنبول سے فرینکفرٹ کی ٹکٹ ابھی بک کروانی ہے۔

امید ہے دوستوں کو یہ Tour پسند آئے گا۔ اگر کوئی تجویز ہو تو عنایت فرمائیں بہت خوشی ہو گی۔ سب بھائیوں کا بروقت تعاون اور دعاؤں کا بہت بہت شکریہ!

والسلام

خاکسار۔ عبد الغفور ڈوگر۔

صدر تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ جرمنی

دنیا کی عظیم مساجد میں سے ایک مسجد "نور سلطان" کازخستان کے دارالحکومت آستانہ میں ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔

باسکٹ بال میچ مابین جرمنی و انگلستان

ماہِ جون 2024 میں ان شاء اللہ جرمنی اور انگلستان کی "تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسو سی ایشن" کی ٹیمز کے درمیان باسکٹ بال کے میچ انگلستان میں منعقد ہونگے۔ انکی کی تفصیل کا جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ دوستوں سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی تجاویز اور تعاون سے نوازیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

Graduates after receiving degrees at the Convocation in 1969 with Prof. Qazi M. Aslam and Hazrat Sahibzada Mirza Mansoor Ahmad, who was the guest of honour at the convocation.

Tahir Bajwa, Ameer Ahmad Pirkoti, Habibur Rehman Tahir, unrecognised, Prof. Qazi M. Aslam, Hazrat Sahibzada Mirza Mansoor Ahmad, unrecognised, unrecognised, Mobashar Solangi, Moeen shah Noor Mohammad, Malik Khalid Masood, Abdul Hayee Basharat, Mahmood Khalid, Waseem Ahmad Chaudhry, unrecognised, Shafqat Dhilon, Shahid Ahmad Saadi, Abdul Majeed Tahir, Shahid Ahmad Saadi; Munawar Ahmad Bajwa, Masroor Ahmad Bajwa, Malik Masood, Khalid, Mabroor Ahmad Bhatti, Asif Ali Parwez, Shahid Taqab Makhdoom, Mubarik Tahir, Abus Salam Cheema and many others are easily recognisable. The other names shall be added as soon as available (help will be appreciated - Photo provided by Abdul Hayee Basharat)

Muhammad Sharif Khan MY DADABA